بیگم
بادشاہ
غلام

شوکت تھانوی

ایک مذاحیہ شاہکار

بیگم بادشاہ غلام

شوکت تھانوی

بگیم بادشاہ غلام کے جملہ حقوق ہندوستان میں
بحق
پرواز بکڈپو نظیر آباد لکھنؤ محفوظ ہیں
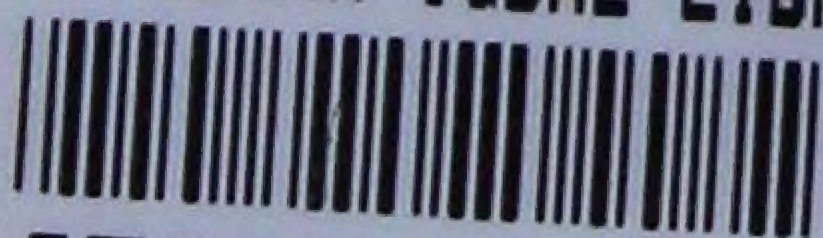
قیمت صرف تین سو نئے پیسے

انتساب ———— •

میں نے بہت سوچا لیکن کچھ میں نہیں
آیا کہ میں اپنی اس کتاب کا انتساب
کیا کروں

شوکت تھانوی

☆

ناشر   زندے رضا مہدی

شایع کردہ پرواز۔ بکڈپو ۔ نظیر آباد ۔ لکھنؤ

طابع   یونائیٹڈ انڈیا پریس۔ لکھنؤ

☆

ہم دُعا کر چکے

پاکستان کو ہمیشہ نہایت مفلس اور کنگال ملک سمجھا گیا اور ہمارے پچھلے حاکموں نے تو اس ملک کی حیثیت ایک بین الاقوامی محتاج خانہ کی بنا رکھی تھی جس کے ہاتھ میں کاسۂ گدائی تھا اور لب پر یہ صدائیں کہ :-

"اللہ کے نام کی روٹی۔ محمد نام کا پیسہ۔ حسن کے نام کا کپڑا
بُلا کر دے بھلا ہو گا

چنانچہ امریکی سخی داتا اپنے مولیشیوں کا پیٹ کاٹ کاٹ کر اسکو گیہوں بھیجدیا کرتے تھے۔ روپے پیسے سے بھی مدد دیا کرتے تھے۔ اور مرے ہوئے گوروں کے پُرانے کوٹ بھی آجایا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ اس مسکین مُلک کے لئے امریکی گھی اور امریکی دودھ بھی آتا تھا۔ جبکے

جو اب میں یہ ملک دامن پھیلا پھیلا کر امریکہ کو جان و مال دولت و اقبال کی دعائیں دیتا رہتا تھا کہ ،، اللہ سلامت رکھے - قدم قدم کی خیر - تیری ہر ما ئی کا ہر لعل جئے - تو دودھوں نہائے پوتوں پھلے اولاد سے گودی اور ڈالر سے جیب بھری رہے "

اب اس سے زیادہ اور کیا ہوگا کہ امریکہ سے جب یہ گیہوں جہاز پر لاد کر پاکستان بھیجا گیا ہے تو اس گیہوں کا باقاعدہ خیر مقدم کیا گیا تھا جن اونٹوں پر یہ گیہوں لادا گیا تھا اُن کے گلے میں تختیاں لٹکائی گئی تھیں جن پر لکھا ہوا تھا -

THANK YOU AMERICA

اور پاکستان کے شاعروں نے مارے غیرت کے یہاں تک کہہ دیا تھا کہ ۔ ہ

تھینک یو کہتے ہوئے اونٹ تو ہم دیکھ چکے

دیکھیئے اور دکھائے ابھی گندم کیا کیا

اونٹوں کی زبان سے تھینک یو کہلوانے میں بڑا شاعرانہ استعارہ تھا مطلب یہ تھا کہ ہم اہل پاکستان فی الحال وہ اونٹ ہیں جس کی کوئی کل سیدھی نہیں ہے مگر اے امریکہ تیرا شکر یہ کہ تو نے اس شتر بے مہار ملک کو فاقوں کی موت سے بچا لیا - اس لیے کہ ہمارے پاس زرخیز زمینیں تو ہیں مگر اس وقت

ہم چونکہ خود اپنی آب ِزرسے آبیاری کر لیتے ہیں لہذا ہم کو اتنی فرصت کہاں کہ فصلیں اگانے کی طرف متوجہ ہو سکیں۔ ہم تو فی الحال اسی طرح دریوزہ گری کر کے پیٹ پالنا چاہتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہ خیرات کھا کھا کر اپنے ضمیر کو مارتے رہے اور خود بے حیائی کی زندگی بسر کرتے رہے۔ رفتہ رفتہ ہاتھ پھیلانا ہماری عادت بن گیا۔ جس نے جو کچھ دے دیا دعائیں دے کر لے لیا۔ نہ پایا کسی نے کچھ تو صدائیں لگاتے رہے مسلسل۔

مگر اب پرامن فوجی انقلاب کے بعد اس ملک کے افلاس کا بھانڈا پھوٹا ہے کہ تجوریوں کے علاوہ سمندر کی گہرائیوں تک سے سونا نکلتا ہے۔ ایک سے ایک پھٹیچر اور شکل صورت کے یتیم کے پاس سے لاکھوں روپے نکلے ہیں۔ ایسے ایسے لوگ لکھ پتی ثابت ہوئے ہیں جو آپ کے پاس آجاتے تو آپ یہی کہتے کہ "شاہ جی آگے بڑھیے برکت ہے۔ بس جمعرات کو آیا کیجیے"۔ پتہ چلایا گیا ہے کہ کروڑپتی ایک سے ایک پڑا ہوا ہے آپ کے اس مفلس ملک میں۔ جب لوگوں نے اپنی آمدنی ظاہر کی تو معلوم ہوا کہ چھپی ہوئی آمدنی ساٹھ کروڑ تو صرف کراچی زون میں تھی۔ بتیس کروڑ لاہور زون میں تھی اور اٹھارہ کروڑ مشرقی پاکستان میں گویا پندرہ جنوری تک تو اعداد شمار خدا جانے کیا ہونگے فی الحال ایک سو دس کروڑ کی چھپی ہوئی آمدنی ظاہر ہوئی ہے۔ ایک کروڑ روپے

سے زائد آمدنی ظاہر کرنے والے کچھ کم نہیں ہیں اس نادار ملک میں پچاس لاکھ روپیے سے زائد آمدنی والے بھی آپ کی دعا سے چشم بد دور کافی ہیں اور سو کے قریب تو صرف وہی لوگ ہیں جن کی آمدنی ایک لاکھ سے زیادہ تھی مگر یہ "مفلوک الحال" لوگ ٹیکس نہیں دیتے تھے اس لیے کہ اتنی سی آمدنی میں کوئی کیا ٹیکس دے اور کیا بچائے۔ ننگی کیا نہائے گی اور کیا نچوڑے گی۔ ان میں سے نہ جانے کتنے لوگ تو وہ تھے جو میلے کچیلے کپڑے پہنے گندے مکانات میں نہایت قابل رحم زندگی بسر کر رہے تھے کہ اگر آپ انکو دیکھ لیتے تو آپ کا دل بھر آتا اور آپ یقیناً ایک آدھ پیسہ ان کی ہتھیلی پر رکھ دیتے۔

وہ مشہور ہے کہ خزانہ پر سانپ بیٹھتا ہے۔ دراصل سانپ وانپ کچھ نہیں ہوتا یہ خود ہی اپنے زمانہ کے سانپ ہوتے ہیں۔ ان کی قسمت میں پیسہ تو ہوتا ہے، پیسے کا سکھ نہیں ہوتا۔ یہ وہی لوگ ہوتے ہیں جن کا مقولہ ہے کہ چمڑی جائے دمڑی نہ جائے۔ پیسہ پیسہ جوڑتے ہیں مگر صرف نہیں کر سکتے بھلا وہ ٹیکس کیا دیں گے۔ جاڑے میں پھٹا ہوا کمبل لپیٹے اکڑا کرتے ہیں اس لیے کہ لحاف اگر بنائیں گے تو اس خزانہ میں روپیے کم پڑ جائیں گے۔ وہ بارش میں سر پہ پاؤں رکھے بھاگا کرتے ہیں چھاتہ اور برساتی خریدنے کی فضول خرچی

نہیں کرتے۔ وہ گرمیوں میں لُو کے تھپیڑے کھانا اور دُھوپ میں جُھلسنا برداشت کرلیتے ہیں مگر راستہ پیدل ہی طے کرتے ہیں اس لیئے کہ بس کا کرایہ خرچ کرنا کفایت شعاری کے اصول کے خلاف ہے اور ان ہی کنجوس لوگوں کے پاس انتقال کے بعد لاکھوں روپے نکلتے ہیں اور اس دولت کا پتہ بھی اس وقت چلتا ہے جب میونسپلٹی والے ان کو دفن کرچکتے ہیں۔

اس قسم کے فقیروں کے متعلق اکثر خبریں آتی رہتی ہیں کہ آج ایک فقیر نے جو ایک گدڑی میں لپٹا ہوا تھا سرراہ ایک فٹ پاتھ پر دم توڑ دیا لوگوں نے کفن دفن کے چندہ کیا۔ مگر جب مرحوم کو گدڑی سے نکالا گیا تو اسی گدڑی میں پچیس ہزار کے نوٹ بھی ایک پوٹلی میں بندھے ہوئے ملے۔ ظاہر ہے کہ اس نامراد فقیر کا کوئی بھی نہ تھا۔ جس کے لیئے اس نے یہ دولت جمع کی تھی۔ اس پیسہ کو اس نے اپنے اوپر کبھی صرف نہ کیا۔ جس طرح ہاتھ پھیلائے سر جُھکائے بھیک مانگا کرتا تھا مسلسل مانگتا رہا۔ سُوکھے ٹکڑے پانی میں بھگو کر کھاتا رہا۔ ہزاروں روپے لیئے بیٹھا رہا مگر وہ روپئے اس کے کام نہ آسکے۔ اگر سچ پوچھیئے تو یہ بھی ایک شامت ہے کہ دولت مل جائے مگر دولت کو صرف کرنے کی اجازت حاصل نہ ہوسکے اس قسم کے "بامراد محروم" نہایت قابل رحم ہوتے ہیں ان کی حالت اس بکری کی سی ہوتی ہے جس کے سامنے سبز چارہ موجود

ہو مگر تھوتھنی پر جالی چڑھا دی گئی ہو۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ غالب نے یہ شعر اپنے اپنے متعلق کہا ہے۔ جی نہیں یہ شعر ان ہی حضرات کے متعلق ہے۔

گو ہاتھ میں جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے
رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

گدڑی کے ان لعلوں کا یہ ملک پاکستان مدتوں کنگال مشہور رہا خیرات پر گذر بسر کرتا رہا۔ جھولی پھیلائے بیٹھا رہا اور اپنی خودداری کو نیلام چڑھائے رہا۔ اس پر رحم تو سب ہی کھاتے رہے مگر اس کو خاطر میں کبھی کوئی نہ لایا۔ اور کوئی خاطر میں لاتا بھی کیسے جن جن کا یہ دست نگر تھا وہ اس کو اپنا بندۂ احسان تو سمجھ سکتے تھے اس کے علاوہ اور کیا سمجھتے۔ یہ اسی کا نتیجہ تو ہے کہ لارڈ اٹیلی کی گھر والی تک نے مُنھ بنا کر کہہ کر کہ "آج کل پاکستان کی پروا ہی کس کو ہے" مگر ان بیگم صاحبہ نے یہ بات ذرا غلط وقت پر کہی ہے اگر اب سے کچھ دن پہلے وہ یہ بات کہتیں تو ایک بات بھی تھی مگر اب حالات بدل چکے ہیں اب پاکستان وہ نہیں رہا ہے جس کی کسی کو پرواہ نہ ہو اب پاکستان کی پُروا کرنا پڑے گی۔ اور پاکستان اپنی پروا خود کرائے گا۔ اب یہ بھیک منگوں کا ملک نہیں ہے۔ اب یہ یتیم خانہ اور دارالمساکین نہیں ہے اب اس کے سمندر سونا اگلتے ہیں۔ اس کی زمینیں دولت پیدا کرتی ہیں اور اُس کے ہر خزانے

سانپ اپنی کیچلی بدل چکے ہیں اور خزانوں پر سے ہٹ گئے ہیں۔ اپنی اس دولت کے احساس نے ہر پاکستانی کو خود دار بنا دیا ہے اور اب اس کو ضرورت نہیں ہے کہ وہ کاسۂ گدائی لئے بین الاقوامی بازار میں فقیرانہ صدائیں بلند کرتا پھرے بلکہ ابھی ۱۵ جنوری کے بعد دنیا اسی کنگال کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھے گی کہ یہ محتاج خانہ تو سونے کی کان نکلا۔ اب اس ملک کی باگ دوڑ ان کے ہاتھ میں نہیں ہے جو کوڑیوں کے ہار پہنے صدائیں لگاتے پھرتے تھے کہ ؎

فقیرانہ آئے صدا کر چلے
میاں خوش رہو ہم دعا کر چلے

اب اس ملک کا نظم و نسق اُن کے ہاتھ میں ہے جو اسی افلاس سے خوش حالی نچوڑ سکتے ہیں اور ایک سے ایک مفلوک الحال کو نچوڑ کر لکھ پتی بنا چکے ہیں۔

ایک قیامت

ادیبوں کے کنونیشن کے بعد اسی کنونیشن کے دو منہ وبین النسیم حجازی صاحب اور ڈاکٹر جاوید اقبال کے اعزاز میں کراچی کے حلقہ ادب اسلامی نے سنٹرل ہوٹل میں ایک عصرانہ دیا جس میں پستہ. خوبانی۔ شاعری۔ اخروٹ۔ تقاریر. کشمش۔ ابلے۔ سگریٹ اور چائے وغیرہ سے حاضرین کی تواضع کی گئی۔ سب سے پہلے اس حلقہ کے ناظم مولانا ماہر القادری نے ایک افتتاحی تقریر فرمائی جس میں اس بات پر زور دیا کہ پاکستان کا ادب اسلامی ہونا چاہیے حاضرین نمکین پستے کھا کھا کر مولانا کی شیریں کلامی کی داد دے رہے تھے۔ اور چلغوزے کھٹاک کھٹاک کر کہہ رہے تھے کہ مولانا بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں اور یہ واقعہ بھی ہے کہ مولانا نے بعض باتیں بڑے تپے کی کہیں مثلاً یہ کہ آپ نے اگر اپنے مسلمان ہونے کی بنیاد پر پاکستان

حاصل کیا ہو تو اپنے کو مسلمان کہتے ہوئے شرماتے کیوں ہیں اور اصلاحی ادب۔ معاشرتی ادب۔ سماجی ادب قسم کے پردے ڈال ڈال کر اسلامی ادب کو چھپانے کی کیوں کوشش کرتے ہیں اس لیئے ظاہر ہے کہ جو صحیح قسم کا اصلاحی ادب ہوگا وہ اسلامی ادب ہوگا جو واقعی معاشرتی ادب ہوگا وہ اس لئے اسلامی ادب ہوگا کہ مسلمانوں کی معاشرت ہی اسلامی معاشرت ہو سکتی ہے۔ مولانا نے اس بات پر زور دیا کہ اسلامی ادب کو اسلامی ادب کہنے سے شرمانا کیا معنی صاف صاف کہیئے کہ یہ اسلامی ادب ہے

مولانا کی اس تقریر کے بعد نسیم حجازی صاحب نے تقریر فرمائی جس کا لُب لُباب یہ تھا کہ ؎

نغمہ ہندی ہے تو کیا لے تو حجازی ہے مری

اس کے بعد ڈاکٹر جاوید اقبال نے بڑی سلجھی ہوئی تقریر کی ان کا موضوع بھی یہی تھا کہ ہم اور آپ اپنے کو مسلمان کہتے ہوئے شرماتے ہیں حالانکہ خود مغربی ممالک کے روشن خیالوں اور آزاد منش حضرات کا یہ عالم ہے کہ ان کی فراخدلی بس اسی وقت تک نظر آتی ہے جب تک آپ عیسائیت کو اپنا موضوع بحث نہ بنائیں عیسائیت پر آپ نے بحث شروع کی اور وہ ٹھیٹھ عیسائی بن کر سامنے آگئے۔ یہ تقریر کرتے کرتے ڈاکٹر جاوید اقبال کو یاد آگیا کہ وہ

پہنے ہوئے ہیں ۔ چنانچہ فوراً موضوع تقریر چھوڑ کر کہنے لگے کہ "حضرات میرے لباس کو نہ دیکھیے بلکہ مجھ کو اندرونی طور پر پڑھیے ۔" گویا وہ یہ کہنا چاہتے تھے کہ ؎

ہوں پوشیدہ اور کافر کھُلا

بہر صورت حاضرین میں سے ایک بزرگ نے زیر لب فرمایا کہ "میاں یہ بھی غنیمت ہے کہ اس لفافہ میں سے یہ مضمون نکل رہا ہے ۔" مطلب ان کا یہ تھا کہ وہ اسی کو غنیمت سمجھ رہے تھے کہ ایک سوٹ پہننے والا اسلامی ادب کی ضرورت پر زور دے رہا ہے بمختصر یہ کہ یہ تقریریں اسی طرح چلغوزوں اور پستوں کے شغل کے ساتھ جاری رہیں امید تھی کہ ان تقریروں کے بعد چھٹی مل جائے گی ۔ مگر توبہ کیجیے جہاں ایک شاعر بھی موجود ہو وہاں یہ کیسے ممکن ہے کہ مشاعرہ برپا نہ ہو چنانچہ وہی ہوا یہ خدمت میرے سپرد کردی گئی کہ ایک مختصر سا دور مشاعرے کا بھی ہو جائے ۔

میں نے حاضرین کو لاکھ سمجھایا کہ اتنی جلدی یہ شعرائے کرام جو یہاں تشریف رکھتے ہیں اسلامی شاعری کے نمونے پیش نہ کر سکیں گے ۔ دوسرے جن دو مہمانوں کے اعزاز میں آپ نے یہ بزم آراستہ کی ہے ان میں سے ایک کے شجرے میں تو خیر شاعر نظر بھی آجاتا ہے مگر دوسرا تو اس معاملہ میں بھی بے قصور

ہے لہٰذا آپ اس کو کس جرم کی سزا دے رہے ہیں۔ مگر توبہ کیجیے کسی نے ایک نہ سُنی اور مشاعرہ برپا ہو کر رہا وجہ یہ ہے کہ اب مشاعرہ بھی موت کی طرح برحق اور ناگہانی سا ہوتا جا رہا ہو سب سے پہلے جناب اقبال صفی پوری نے ایک غزل سنائی جو اس اعتبار سے اسلامی ضرور تھی کہ اس میں کسی زاہد یا ناصح کا مذاق نہیں اُڑایا گیا تھا اور بظاہر خلاف اسلام کوئی بات نہ تھی۔ ان کی غزل کے بعد میں نے اعلان کر دیا کہ " ابھی جاوید اقبال صاحب کو اقبال صاحب اپنا کلام سنا رہے تھے " اس واقعاتی اعلان پر بھی بعض لوگ دُور کی کوڑی لا کر ہنس دیئے، پھر جناب محشر بدایونی برپا ہوئے۔ جناب منظر صدیقی نے غزل سرائی فرمائی۔ حضرت تابش دہلوی نے مسعود تابش کی زبانی اردو کی ایک غزل سُنائی یہاں تک کہ بشیر فاروق صاحب نے دو چار قطعات کی اڑلی میں نے ایک پیروڈی میں پناہ حاصل کی اور جناب دیب سہارنپوری نے نعت شریف پڑھ کر مولانا ماہر القادری کی پوزیشن نازک کر دی کہ اب وہ کون سی اسلامی شاعری پیش کریں گے مولانا ماہر کے بعد جناب اسد ملتانی نے دو شعر سُنائے جن میں سے ایک ادبی تھا اور ایک اسلامی اور آخر میں میری درخواست پر ڈاکٹر جاوید اقبال نے اپنے والد محترم علامہ اقبال کا ایک شعر سنا کر اس ناگہانی مشاعرے کو ختم کر دیا۔

تقریریں ہوئیں۔ مشاعرہ ہوا۔ اسلامی ادب پر زور دیا گیا۔ ثابت یہ کیا گیا کہ ناول بھی اسلامی ہو سکتے ہیں۔ غزلیں اور نظمیں بھی اسلامی ہو سکتی ہیں مختصر یہ کہ اگر کوشش کی جائے تو شعر و ادب کے ہر گوشے میں اسلامیات کے لیے جگہ پیدا کی جا سکتی ہے۔ وہاں میں تو خاموش بیٹھا رہا۔ مگر واپسی میں جب ایک صاحب نے مجھ سے دریافت کیا کہ کیوں جناب مزاح کو آپ کیونکر مشرف بہ اسلام کر سکتے ہیں تو میں نے اپنا نظریہ بیان کرتے ہوئے اپنے کو دانستہ سنجیدہ بنا کر یہ عرض کیا کہ :-

"جناب والا ہر وہ چیز اسلامی ہے جو خلاف اسلام نہ ہو۔ اگر مزاح کا ہدف خود اسلام کو نہ بنایا جائے۔ اور غیر اسلامی عناصر کی تائید نہ کی جائے تو آپ مزاح کو بھی مزاح المومنین ہی کہہ سکتے ہیں۔ چنانچہ میں نے آج تک محمد احمد خدا اور رسول اور بزرگان دین یا عقائد کا مذاق نہیں اڑایا ہے"

یہ سنتے ہی ایک صاحب واقعی اس طرح چیخ اٹھے گویا پولیس کو آواز دے رہے ہیں کہ :-

"پکڑا گیا۔ پکڑا گیا۔ مسلمان ہے اندر سے"

اور میں واقعی انکار نہ کر سکا اس لئے کہ جہاں تک اس جرم کا تعلق ہے میں اقبالی مجرم ہوں

اکبرؔ الہ آبادی نے اب سے بہت پہلے کہا تھا کہ :-

رقیبوں نے رپٹ لکھوائی ہے جا جا کے تھانے میں
کہ اکبر نام لیتا ہے خدا کا اس زمانے میں

مگر اب جو زمانہ ہے اس میں یہ جرم اکبرؔ کے زمانے سے بھی زیادہ سنگین بن چکا ہے۔ اسلامی ادب کے نام پر ہنسنے والوں کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ یہ نام لے کر خواہ مخواہ بھی آدمی نکو بن کر رہ جاتا ہے ہم تو اسی کو غنیمت سمجھتے ہیں کہ خلافِ اسلام ادب ہی پیش نہ کیا جائے اس کوشش کو بھی اس دور میں معمولی جہاد نہ سمجھیے بلکہ یقین رکھیے کہ اگر اس کوشش میں آپ کامیاب ہو گئے تو اسلامی ادب کے لیے پذیرائی کا میدان اسی سے ہموار ہو سکے گا

پہلے عورت اُسکے بعد مرد

یہ جو مہذب دنیا کے مردوں نے "لیڈیز فرسٹ" والی تہذیب رائج کی ہے اس میں خواتین کی عزت افزائی یا خواتین کو بے وقوف بنانا ہی مقصود نہیں ہے بلکہ بڑی بڑی مصلحتیں ہیں۔ مثلاً یہی کہ ہر جگہ عورتوں کو پہلے بھیجا جائے تاکہ اگر کوئی مصیبت راہ میں حائل ہو تو پہلے وہ اس سے دوچار ہو لیں اور جو کچھ گذرتا ہے وہ اُن پر گذر جائے مرد اس مصیبت سے محفوظ رہ سکیں۔ چنانچہ اب بڑی چالاکی کے ساتھ یہ کہا جا رہا ہے کہ ستاروں کا جو سفر درپیش ہے اس کے لیے مردوں سے زیادہ عورتیں موزوں ہیں اور لیڈ فرسٹ کے اصول کو پیش نظر رکھ کر مرد یہ گستاخی کر بھی نہیں سکتے کہ عورتوں کو پیچھے چھوڑ کر خود پیش قدمی کر جائیں اس طرح وہ اس دنیا ہی میں نہیں بلکہ ساری کائنات میں بدنام ہو جائیں گے کہ عجیب جانگو ہیں۔

اس دنیا کے لوگ بھی کہ ان کو تہذیب کا یہ بنیادی اصول بھی نہیں معلوم کہ لیڈیز کو آگے بڑھایا جاتا ہو اور مرد اُن کے پیچھے پیچھے چلتے ہیں۔ نیاز مندی کے ساتھ فدوی بنے ہوئے۔

رائٹ فیلڈ (اوہیو) کے مرکز میں ایرمیڈیسن لیبارٹری نے بتایا ہے کہ کائنات میں سفر کرنے کے لیئے مرد جتنا ناموزوں ہیں عورتیں اتنی ہی موزوں ثابت ہوئی ہیں یہ تجربہ اس وقت ہوا جب سائنسدانوں نے تجربہ کے کیبن میں مردوں اور عورتوں دونوں کو رکھا۔ اس کیبن میں کائناتی سفر کا ماحول پیدا کر دیا گیا تھا۔ اس ماحول میں بے صبر مرد تھوڑی ہی دیر کے بعد گھبرا گئے، اور انھوں نے جھنجھلانا شروع کر دیا مگر عورتیں نہایت صبر وسکون کے ساتھ بیٹھی رہیں کیا مجال کہ ذرا بھی گھبراہٹ ان پر طاری ہو۔ اُن کی جبیں پر ایک بھی شکن پڑی ہو وہ حسب معمول تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد اپنا پرس کھول کر آئینہ دیکھ لیتی تھیں اور اپنا میک اپ درست کر لیتی تھیں بالوں پر ہاتھ پھیر کر اُن کو درست کر لیتی تھیں اور چھوٹے سے ریشمی رومال سے لپ اسٹک پھیل گئی ہو تو وہ اس کو درست کر لیتی تھیں یہ مشق اسلیئے جاری تھی کہ اگر وہ واقعی کسی نئی دنیا میں پہونچیں تو وہاں کے باشندے ان کو دیکھ کر بس دیکھتے ہی رہ جائیں اور پہلی ہی نظر میں اُن کے حسن کا

جادو اُن اجنبیوں کو مسحور کردے

عورتوں کے اس اطمینان اور مردوں کی اس سراسیمگی کو دیکھ کر یہی نتیجہ نکالا گیا ہے کہ مردوں کو کائناتی سفر پر بھیجنا غلط ثابت ہوگا اس کی ابتدا عورتوں ہی سے کرائی جائے اور لیڈیز فرسٹ ہی سے کام لیا جائے اس کے بعد جب عورتیں اس سفر سے واپس آکر اپنے تجربات سے مردوں کو آگاہ کریں گی اور ان کو اس سفر کی تربیت دیں گی تو شاید مرد بھی ہمت کر گذریں ورنہ سچ تو یہ ہے کہ اس قسم کی مردانہ ہمت آج کل کی عورتوں ہی میں نظر آتی ہے۔ مرد تو دو کوڑی کا بھی نہیں رہا ہے۔ خواہ مخواہ بھی مونچھوں پر تاؤ دیتا پھرتا ہے اور جب کوئی مہم درپیش ہوتی ہے تو لیڈیز فرسٹ کہہ کر عورتوں کو آگے بڑھا دیتا ہے اور خود اُن کی آڑ میں چھُپ جاتا ہے۔ ان مردوں نے مہذب ہونے کے بعد ہر میدان میں عورتوں کو ڈھال کے طور پر استعمال کرنا شروع کر دیا ہے اور دیکھ لیجیے گا کہ اس قسم کے خطرناک تجربے کیا معنی مرد تو جہنم کے دروازے پر پہونچ کر بھی عورتوں سے کہے گا کہ "لیڈیز فرسٹ"

اس کائناتی سفر کے سلسلے میں یہ لیڈیز فرسٹ والی بات کوئی انتہا

نہیں ہے۔ روس نے سب سے پہلے لیڈی لائیکا ہی کو اس سفر پر روانہ کیا تھا۔
ورنہ کیا یہ نہیں ہو سکتا تھا کہ بجائے اس نازک اندام کتیا کے کسی قوی ہیکل
کتے کو بھیجا جاتا مگر غالباً اس تجربے کے وقت بھی کتوں نے بھی یہی عذر پیش
کیا تھا کہ آخر ہم ایک مہذب ملک کے کتے ہیں۔ ہم سے اس گنوارپن کی توقع
کیوں کی جارہی ہے کہ ہم اپنی لیڈیز یعنی کتیوں کو پیچھے چھوڑ کر خود آگے بڑھ جائیں
گے یہ اعزاز پہلے کسی کتیا کو دیا جائے گا چنانچہ لائیکا کو بھیجا گیا تھا جو آج تک
واپس نہیں آئی ہیں اور روس کے کتے اپنی اس دانشمندی پر خوش ہیں کہ
اگر انھوں نے لیڈیز فرسٹ کے اصول پر عمل نہ کیا ہوتا تو بجائے اس معزز
کتیا کے نہ جانے کون سا کتا اس تجربہ کی بھینٹ چڑھ جاتا۔ خیر وہ کتوں
کو بھیجنے کا زمانہ تو گیا اب انسان کو بھیجنے کی باری آئی ہے تو مردوں نے
ابھی سے یہ اڑا دی ہے کہ اس کائناتی سفر کے لئے عورتیں ہی موزوں سمجھی گئی
ہیں مرد تو نہایت ناکارہ ثابت ہوا ہے اور بس اسی قابل ہے کہ لیڈیز فرسٹ
کہہ کہہ کر عورتوں کو مقدم اور اپنے کو موخر بناتا رہے۔

مقصد صرف یہ ہے کہ یہ بات تو سب ہی جانتے ہیں کہ اس تجربہ میں صرف
وہی حصہ لے سکتا ہے جو اپنی جان کو عزیز نہ رکھتا ہو۔ اس سیّارے میں بیٹھ کر
اڑنے کے بعد سب سے پہلے تو یہی کہنا پڑتا ہے کہ ؎

پہلی منزل ہے فنائے رہروِ راہِ بقا
آگے قسمت ہے تری اور ہمت مردانہ ہے

یعنی اُڑنے والا خود ہی یہ طے کر لیتا ہے کہ جو بھی اڑے ہم اس دنیا سے اور صرف روح ہی قفسِ عنصری سے پرواز نہیں کر رہی ہے بلکہ قفسِ عنصر بھی پرواز کر رہا ہے عالم بالا کی طرف اب یہ دوسری بات ہے کہ یہ حضرت ایسے "لاالف انثیٰ پروڈ" ثابت ہوں کہ موت ان کو اس خود کشی کے باوجود نہ پوچھے بلکہ یہ موت کے پیچھے دوڑیں تو وہ سر پر پیر رکھ کر بھاگے ورنہ بنا لوئے اعتبار یہ نوفی صدی تو امید تو یہی ہوتی ہے کہ بس گئے یہ حضرت لہٰذا مرد تو یہ چاہتے ہیں کہ جب تک یہ کائناتی سفر ہر طرح محفوظ نہ ہو جائے اور جب تک اس سفر سے واپسی یقینی نہ ہو جائے وہ دوزاتی پیچھے ہی رہیں اور خواتین کو لیڈیز فرسٹ کہہ کر آگے بڑھاتے رہیں تاکہ تمام تجربے ان پر گزر جائیں اور مرد اس سفر کا آغاز اس وقت کریں جب یہ تجرباتی مرحلہ گذر جائے اور یہ سفر انگریزی کا SUFFER باقی نہ رہے۔

رہ گئیں عورتیں وہ بھی در اصل اتنی بیوقوف نہیں ہیں جتنی نظر آتی ہیں وہ ان خود غرض مطلب پرست اور کائیاں مردوں کی تمام چالاکیوں کو بخوبی سمجھتی ہیں کہ مرد ان کو کس کس طرح قربانی کی بکریاں بناتا رہتا ہے۔ بڑے محبت کے دعوے کرتا ہے۔ ناز بردار بنتا ہے۔ نگاہِ ناز سے شہید ہوتا رہتا ہے روز ایک نئی ادا پر ایک تازہ

موت مرتا ہے اور کسی دن بھی اس کا جنازہ نہیں نکلتا۔ عورت کی چشم وابرو کے اشارے پہ جان تک دینے کو تیار رہتا ہے مگر جب کوئی ایسا امتحان سامنے آجاتا ہے جس میں واقعی مرنے جینے کا سوال ہو تو عورت کو آگے بڑھا کر لیڈیز فرسٹ ڈھونگ رچانا شروع کر دیتا ہے ایسے خود مردوں کی اس دنیا میں وہ کرجہاں جنسِ وفا راشن کارڈ پر بھی نہ مل سکے مسلسل بیوقوف بنے جانے سے تو اچھا یہی ہے کہ ؏

رہیئے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو

اور کیوں نہ ان تجربوں کے لئے اپنے کو پیش کر دیں موت برحق تو ہے ہی کیوں نہ زندگی کی تلاش میں آئے۔ اگر تجربہ کامیاب ہوگیا تو کائنات کی ماں کہلائیں گی ورنہ مرحومہ ومغفورہ تو ہیں ہی

بنگال کا جادو

پاکستان رائٹرس کنونیشن کراچی میں آج ۲۹ر جنوری سے شروع ہوگیا
اس کنونیشن کا ادیبوں اور شاعروں کے مختلف حلقوں میں مختلف
حیثیتوں سے خیر مقدم کیا گیا ہے۔ بات یہ ہے کہ مشرقی اور مغربی پاکستان
سے جو ڈھائی سو کے قریب ادیب اور شاعر اس کنونیشن میں شرکت
کے لئے یکجا ہوئے ہیں ان کے علاوہ بھی تو مشرقی اور مغربی پاکستان کی
باقی آبادی کسی نہ کسی حیثیت سے ادیب تو ہی ہی اور اگر ادیب نہ ہی تو
بھی بقیہ آبادی کے شاعر ہونے میں تو کسی کو کوئی شک ہو ہی نہیں سکتا
لہذا وہ سب کے سب اس کنونیشن سے سخت ناراض ہیں کہ آخر ان کو
کیوں نظر انداز کیا گیا اور دعوت نامے کیوں نہ بھیجے گئے۔ کنونیشن منعقد
کرنے والوں سے اگر پوچھا جائے تو وہ غالباً یہی کہیں گے کہ اس قسم کے

کنونیشن میں

کنونیشن میں اور میونسپل الیکشن میں تھوڑا سا فرق ہوتا ہے۔ میونسپل الیکشن میں تو ووٹروں کی فہرست شائع کرکے سب کو مدعو کیا جا سکتا ہے مگر اس قسم کے کنونیشن میں مشرقی اور مغربی پاکستان کی پوری آبادی کو سمیٹ لینا ممکن نہیں۔

یہ جواب اطمینان بخش ہو یا نہو بہر صورت وہ تمام بے شمار ادیب اور شاعر جو نہ جانے کب سے ایک ایک تخلص لیئے بیٹھے ہیں اس کنونیشن مدعو نہیں کیئے گئے سخت ناراض ہیں اُن حضرات میں سے ایک آدھ سے تو شرف نیاز خود ہم کو بھی حاصل ہو چکا ہے جن سے اپنی عزت و آبرو بہ مشکل ہم بچا سکے حالانکہ ہم نہ داعیان کنونیشن میں سے ہیں نہ اس کنونیشن کے منتظمین میں ہمارا شمار ہو سکتا ہے۔ مثلاً ایک صاحب تخلص بزرگ تشریف لائے اور بغیر کسی تمہید کے آتے ہی برس پڑے کہ "کیوں جناب آپ بتا سکتے ہیں کہ یہ جو ادیبوں اور شاعروں کی کانفرنس ہو رہی ہے اس میں آخر مجھ کو مدعو کیوں نہیں کیا گیا حالانکہ میں بارہ سال سے شعر کہہ رہا ہوں بڑے بڑے انڈو پاک مشاعروں میں شرکت کر چکا ہوں۔ تین بین الملکتی مشاعروں کے تمغے میرے پاس ہیں۔ دس بارہ شاگردوں کا استاد ہوں۔ رات بھی ایک مشاعرے میں میری ہی غزل حاصل مشاعرہ سمجھی گئی آپ کی سمع خراشی تو ہوگی

چند اشعار پیش کرتا ہوں۔ عرض کیا ہے کہ ـــــــ

وہ تو کہئے کہ ان حضرت نے غزل شروع کر دی اور میں نے داد دے کر ان کو رام کر لیا ورنہ اُن کے تیور تو یہ تھے کہ گویا مرنے مارنے کو تیار ہو کر آئے ہیں۔

ایک اور صاحب علین اس وقت تشریف لے آئے جب میں کنونیشن میں شرکت کے لئے جانے ہی والا تھا۔ تشریف لاتے ہی کہنے لگے "کنونیشن تشریف نہیں لیجائیں گے"، عرض کیا کہ جی ہاں بس اسی ارادہ سے نکلا تھا۔ بڑے تپاک سے بولے "تو بسم اللہ میں بھی چل رہا ہوں نہ جانے کس بھول چوک میں مجھے یہ دعوت نامہ بھیجنا یہ لوگ بھول گئے ہیں۔ مگر اتنے بڑے اہتمام میں اس قسم کی بھول چوک ہو ہی جاتی ہے اس پہ اگر میں خفا ہو کر بیٹھ رہوں تو یہ میری زیادتی ہے۔ یہ ادبی خدمت ہے اور ہم میں سے ہر ادب کے خادم کا فرض ہے کہ سب مل جل کر اس کنونیشن کو کامیاب بنائیں۔ لہذا تشریف لائیے"، اب میں سخت پریشان کہ کس طرح ان حضرت کے ساتھ جاؤں جن کو بلایا ہی نہیں گیا اور ان سے عذر کروں تو کیا کروں۔ بہر صورت مردہ بدست زندہ کے انداز سے جلسہ گاہ کے دروازہ تک تو اُن کے ساتھ گیا اس کے بعد مجمع میں اُن حضرت کو ایک ایسی جھکائی دی کہ میں ہال کے اندر تھا اور وہ ـــــ اللہ جانے ان کا کیا حشر ہوا۔

کراچی۔ اسے ہال میں پہنچے ہیں پہنچے تو مشرقی اور مغربی پاکستان کا ایک سے ایک "دانشور" مع حضرت احسان دانش کے نظر آیا اور ان میں جو مندوبین تھے وہ ایک ایک بلّا لگائے ہوئے تھے۔ جس کی سبز زمین پر ایک تیر والا قلم بنایا گیا ہو۔ اور اس تیر کو اپنے کوٹ یا شیروانی پر لگا کر یہ سب دانشور درصل "دانش پر" نظر آ رہے تھے۔ افتتاحی اجلاس شروع ہوا تو صدر مجلس استقبالیہ شاہد احمد صاحب دہلوی نے بھی اس عام شکایت کا ذکر کیا جو ہم بیان کر چکے ہیں کہ :۔

"ہم نے کوشش کی ہے کہ یہ کنونشن پاکستانی ادیبوں کا ایک نمایندہ اجتماع ہو اس لئے دعوت نامے جاری کرنے میں اس بات کا بہت خیال رکھا گیا ہے کہ کسی آبگینہ کو ٹھیس نہ لگنے پائے۔ عددی حساب سے پاکستانی ادیبوں کی تعداد ہزاروں بلکہ لاکھوں پہ ہو۔ ظاہر ہو کہ ہم سب کو نہیں بلا سکتے تھے لہذا ایک خاصی تعداد کو شکوہ ہو کہ ہم نے اُن کو نظر انداز کر دیا۔"

اب کون شاہد احمد صاحب کو سمجھائے کہ اس معذرت میں بھی آپ صرف ادیبوں کا ذکر کر کے شاعروں کو نظر انداز کر گئے ہیں حالانکہ ادیب تو پھر بھی اقلیت میں ہیں مگر شاعروں کو تو وہ اکثریت حاصل ہو کہ اگر وہ اپنی فوج بنالیں اور ع

مفعول و فاعلات و مفاعیل و فاعلن

کارجز پڑھتے ہوئے دھاوا بول دیں تو یہ کنونیشن کیا معنی وہ چاہیں تو کنیٹر تک فسخ کرکے رکھدیں۔ وہ تو کہیے اُن کو فکر و سخن کے علاوہ اور کوئی فکر ہی نہیں ہو ورنہ اُن کو نظر انداز کرنا ہنسی ٹھٹھا نہیں ہو۔

کنونیشن کے افتتاحی اجلاس کے صدر بنگال کے جادو بیاں شاعر جسیم الدین تھے ان کے طویل خطبۂ صدارت کے بعد جو بنگالی میں تھا اس بات کی کوشش کی گئی کہ اس خطبہ کا ترجمہ حاضرین میں تقسیم ہو جانے کے باوجود اسٹیج سے سنایا بھی جائے مگر حاضرین نے متفقہ طور پر کہا کہ یہ خطبہ بنگالی میں سنکر اُر دو پڑھ چکے ہیں لہٰذا اب اس زحمت کی ضرورت نہیں چنانچہ اسٹیج سکریٹری جمیل الدین صاحب عالی نے کچھ اعلانات سناتے ہوئے ایک عجیب بات یہ بھی بتائی کہ اس کنونیشن میں بہت سے حضرات جن کو مدعو کیا گیا تھا موجود نہیں ہیں اور بہت سے حضرات جن کو مدعو نہیں کیا گیا تشریف رکھتے ہیں کچھ حضرات جو شرکت کے لئے آرہے ہیں اس وقت ریل میں بیٹھے آرہے ہوں گے اور کچھ حضرات ریل پیل سے فائدہ اُٹھا کر تشریف لے آئے ہیں لہٰذا دوسرے اجلاسوں کے وقت کڑی نگرانی کرنا پڑے گی کہ صرف مندوبین ہی ہال کے اندر داخل ہو سکیں یعنی صرف وہ دانشور جن کو بلّا لگا کر "دانش ور" بنا دیا گیا ہو۔

اس افتتاحی اجلاس سے واپسی ایک ٹیکسی والے نے بڑی سادگی سے پوچھا کہ ”کیوں سیٹھ یہ نمایش ابھی جالو رہے گی یا خلاص ہو گئی۔“ اس کو تو خیر ہم نے واجبی سا جواب دیدیا۔ مگر اس نے ادیبوں کے کنونیشن کو ”ادیبوں کی نمایش کا نام اچھا دیا ہی اور یہ واقعہ بھی ہی کہ اس نمایش میں ایک سے ایک قابل دید ادیب اور شاعر نظر آیا اتنے ادیبوں اور شاعروں کو بیک وقت جمع کر دینا بجائے خود ایک کارنامہ ہی۔ خدا کرے یہ کارنامہ بس اسی حد تک نہ رہے بلکہ اہل قلم کو جو بقلم خود بنے ہوئے ہیں اُن کے حقوق دلوانے کا فرض یہ کنونیشن ادا کرے

انڈا مُرغی اور مُرغا

اخبارات میں انڈا مُرغی کے متعلق بعض نہایت ہولناک اعداد شمار شائع ہوئے ہیں جن کو پڑھ کر چکر سا آنے لگتا ہے کہ خداوندا ہم اہل کراچی کا معدہ ہو یا پولٹری فارم بھلا غضب خدا کا ۳۱ دسمبر ۱۹۶۱ء کو ختم ہونے والے پچھلے سال ایک سال میں ہم اہل کراچی نے خدا ہم کو نظر بد سے بچائے بہتر کروڑ تو صرف انڈے کھائے ہیں اور ساڑھے آٹھ لاکھ مرغیاں چٹ کی ہیں۔ ابھی اس بلا نوشی کا اندازہ کرنے کے بعد جب غش کھا چکے ہیں اور ہوش ٹھکانے آتے ہیں تو حساب لگانے کو جی چاہتا ہے کہ ان بڑے اعداد شمار میں سے خود ہمارے حصہ میں کتنی مرغیاں اور کتنے انڈے آئے ہونگے اور جب یہ حساب لگاتے ہیں تو ان اعداد شمار کا پول کھل کر سامنے آجاتا ہے اور بے ساختہ ہنسی آتی ہے کہ یہ اخبار والے بھی رائی کو پربت بنانے میں اپنا

جواب نہیں رکھتے۔ یہ اعداد شمار غلط نہیں ہیں مگر سال میں تین سو پینسٹھ دن ہوتے ہیں اور کراچی کی آبادی آپ کی دُعا سے پندرہ لاکھ کے لگ بھگ ہو اب ذرا حساب لگا کر دیکھ لیجیے کہ تقریباً ڈیڑھ انڈا فی کس یومیہ پڑتا ہو اور سال بھر میں نصف کے قریب مرغی ہر باشندۂ کراچی کے حصّہ میں آسکتی ہو۔ ایک سال میں ایک بھی نہیں بلکہ آدھی مرغی جس کا یہ ڈھول پیٹا جا رہا ہو اور اتنی سی بات کا ایسا بتنگڑ بنایا جا رہا ہو گویا ہم سوائے انڈا مُرغی کے اور کچھ کھاتے ہی نہیں حالانکہ اگر غور کیجیے اور حساب لگائیے تو پتہ چلے گا کہ ایک داڑھ بھی گرم نہیں ہوئی

سال کے تین سو پینسٹھ دنوں میں سے ایک سو چار دن تو وہی ہوتے ہیں جو گوشت کے ناغہ کے دن کہلاتے ہیں اور یہی وہ دن ہوتے ہیں جن میں گوشت کا غم غلط کرنے کے لیے انڈا مرغی سے معدے کو بہلانا پڑتا ہو لہذا جو منتظم قسم کے لوگ ہیں وہ اپنا روز کا ڈیڑھ انڈا بچاتے رہتے ہیں تاکہ بدھ اور جمعرات چار وقت ان ہی ۱۰۰ انڈوں کا سالن یا آملیٹ وغیرہ کھا کر خدا کا شکر ادا کرسکیں۔ رہ گئی مرغی وہ چونکہ ایک سال میں نصف مرغی فی کس بیٹھتی ہو لہذا ۱/۴ مرغی عید کے لیے اور ۱/۴ بقرعید کے لیے محفوظ رکھی جاتی ہو۔ مُرغی کی دو ٹانگوں میں سے جب ایک ہی ٹانگ ایک سال میں ایک

شخص کو میسّر آئے تو سوال یہ ہے کہ وہ کیا کھائے گا کیا خلال کرے گا اور مُرغی کی ایک ٹانگ کا کبتک قائل نہ ہو گا۔

خدا خیر کرے آج میں کچھ حساب کتاب سے زیادہ ہی کام لے رہا ہوں اور رہ رہ کر وہ بزرگ یاد آرہے ہیں جو اپنی روزمرہ کی زندگی کچھ اسی قسم کا حساب لگایا کرتے تھے کہ ان کے کانوں میں ایک چھناکے کی آواز آئی اور وہ چلاّئے :-

"ارے بھئی یہ کیا توڑا؟"

"غلام نے دور ہی سے جواب دیا "حضور گلاس ٹوٹ گیا ہے گر کر"

یہ سنتے ہی وہ برس پڑے۔ "اس مہینہ کا یہ دوسرا گلاس ٹوٹا ہے گویا سال کے چوبیس ہوئے"

یہ حضرت اپنے گھر میں تو یہ حرکتیں نہ بے ساختگی کے ساتھ کرتے ہی رہتے تھے مگر ایک دن ان کو پڑوس میں ایک جگہ تعزیت کرنے جانا پڑا۔ ان صاحب نے ان کو دیکھ کر اپنی غم نصیبی کی تفصیلات شروع کر دیں کہ "بندہ نواز کیا پوچھتے ہیں آپ ہماری حرماں نصیبی کا عالم بیس دن پہلے اسی بچے کی ماں فوت ہوئی تھی اور آج یہ بچہ چل بسا۔ اب تو آنسو بھی خشک ہو چکے ہیں ایک ہی مہینے

میں دو جنازے اٹھائے ہیں "ایک مہینے میں دو جنازے سنتے ہی وہ حسب عادت بول اُٹھے "یہ تو سال کے چوبیس ہوئے۔

مسلمانوں کو یہ طعنہ ہمیشہ یاد رہے گا کہ ان کو حساب کتاب نہیں آتا اور وہ کچھ عجیب علی الحساب قسم کے لوگ ہوتے ہیں وہ علی الحساب کماتے ہیں اور علی الحساب ہی خرچ کرتے ہیں حالانکہ یہ غلط ہے تقسیم ملک سے پہلے ہندوؤں اور مسلمانوں میں فرق یہ تھا کہ حساب داں تو دونوں ہی تھے مگر مگر ہندو جمع کرنا اور جوڑنا جانتے تھے اور مسلمان تفریق کرنے اور گھٹانے میں اس حد ماہر تھے کہ آمدنی کی امید پر خرچ شروع کر دیا کرتے تھے اور یہ بھی یاد نہ رکھتے تھے کہ جس آمدنی کی امید تھی وہ ہوئی بھی یا نہیں البتہ خرچ کی تفصیلات اُن کے سامنے ہوتی تھیں۔ بادل دیکھ کر گھڑے توڑ دینے کا فن آج بھی دنیا کی اگر کوئی قوم جانتی ہے تو وہ ہم ہی ہیں کہیں سے روپیہ آجانے کی امید پیدا ہوجانا شرط ہے خواہ وہ امید موہوم ہی کیوں نہ ہو پھر دیکھیے ہماری شاہ خرچی کہ جب تک اس متوقع رقم کو پیشگی ہی ختم نہ کرلیں گے چین سے نہیں بیٹھ سکتے اور اگر وہ رقم نہ مل سکے تو اس کی تقدیر کا کھیل سمجھ کر قرض پاٹتے رہیں گے۔ مختصر یہ کہنا کہ ہم حساب جانتے ہی نہیں سراسر زیادتی ہے۔ اور یہ بات ہے کہ حساب کی کسی مد میں طاق ہیں اور کسی

میں بالائے طاق۔

کراچی میں انڈا مرغی کے سلسلے میں جو حساب لگایا گیا ہو اور اس کا جو تجزیہ ہم نے کیا ہے اس کے متعلق آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ کراچی کی پندرہ لاکھ کے قریب جو آبادی ہے ان میں سے کتنے ایسے ہیں جن کو حصہ رسدی ۲/۱ انڈا یومیہ اور یہ نصف مرغی سالانہ بھی میسر آسکتی ہو اور کتنے ایسے جو دونوں وقت مرغ مسلم بھنبھوڑنے کی حیثیت رکھتے ہیں کہ مرغے کو چرغا تک بنا کر کھاتے رہتے ہیں یہ درست ہے اور اس اعتراض کو ہم تسلیم کرتے ہیں اس میں کوئی شک نہیں کہ ان پندرہ لاکھ میں سے لاکھوں ایسے بھی ہیں جو انڈا

مرغی تو درکنار دو وقت کی چٹنی روٹی کے لیے بھی ترستے رہتے ہیں اور نہ جانے کس طرح اپنا پیٹ پالتے ہیں وہ روکھی سوکھی کھا کر اپنے حصے کے انڈے اور مرغی سے دست بردار ہو جاتے ہیں۔ لہذا یہ ان ہی کے حصے کے انڈے ہوتے ہیں جو بڑے آدمیوں کے برک فاسٹ میں بڑے آدمیوں کی بڈ ناگ میں اور بڑے آدمیوں کے انڈے کے حلوے میں نظر آتے ہیں اور یہ ان ہی کے حصے کی بچی ہوئی بے شمار مرغیاں ہوتی ہیں جو بڑے آدمیوں کے لیے ہر صورت میں حاضر رہتی ہیں کہ خواہ ان کو تنور میں سینک کر چرغے کی صورت میں کھایا جائے خواہ بھون کر مرغے کی صورت میں کھایا جائے خواہ ان کا سوپ

پیا جائے خواہ ان کا پلاؤ کھایا جائے

دراصل یہ ہمارے حساب کی غلطی نہیں بلکہ ہمارے علی الحساب معاشرے کے علی الحساب نشیب و فراز کی غلطی ہے کہ جو حساب ہم نے لگایا ہے وہ ٹھیک تو ہے مگر ٹھیک بیٹھتا نظر نہیں آتا جو اوسط ہم نے قائم کیا ہے وہ آبادی کے تناسب سے بالکل درست ہے۔ یعنی اگر آپ کراچی کی مردم شماری اور مرغ شماری کے اعداد کو آمنے سامنے رکھ کر منصفانہ تقسیم کریں تو حساب یہی بیٹھے گا کہ فی کس ڈیڑھ انڈا یومیہ اور فی کس نصف مرغی سالانہ کے حساب سے تقسیم ہو اب اس کا تو کوئی علاج نہیں کہ کسی میں دوسروں کا حق خریدنے کی طاقت اور استطاعت ہے اور کسی میں اپنے حق کے تحفظ کا بھی بوتا نہیں اگر یہ تقسیم مساوی ہو جائے تو سب ہی ہمارے اس حساب کے قائل ہو سکتے ہیں مگر یہ حساب صحیح ہو یا غلط بہر صورت اخبارات نے چونکا دینے والے اعداد و شمار پیش کئے ہیں اُن کے مضحکہ خیز ہونے میں تو اب بھی کوئی شک نہیں

کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

بعض لوگوں کو خواہ مخواہ بھی بھڑ لڑھکانے کی عادت ہوتی ہے
اور عام گفتگو میں بھی وہ لٹریچر بگھارنے کے شوق میں کتابی زبان
بولنا شروع کر دیتے ہیں اور اتنے بڑے بڑے الفاظ بولتے ہیں کہ سننے
والا دل ہی دل میں ہیجے اور معنی یاد کرتا رہ جاتا ہو مثلاً اسی قسم کے ایک
کرم فرما غریب خانہ پر آکر مہمان ہو گئے تھے جانا تھا اُن کو بھارت کے سفر پہ
مگر قیام فرما اس لیے تھے کہ ویزا بننے میں دیر ہو رہی تھی لہذا جب بھی ویزا آفس
سے واپس آتے تھے اور ان سے پوچھا جاتا تھا کہ :۔

"کہیئے جناب آج کیا ہوا ؟"

وہ اس سیدھی سی بات کا جواب یہی دیتے تھے کہ :۔

" صاحب تحیر ہو گیا۔ حسب معمول تعجیل کے بجائے تعویق سے کام

لے رہے ہیں اربابِ حل و عقد"
دوسرے دن پھر پوچھا گیا کہ "آج کی خبر سنائیے بندہ نواز"
وہ پھر یہی جواب دیتے کہ "آج بھی تحیر ہو گیا۔ بدستور تعجیل کے بجائے تعویق"
آخر ایک دن وہ نہایت شگفتہ سے تشریف لائے اور جب اُن سے پوچھا گیا تو ہنسکر بولے :-
"آج تو بفضلہ کامراں واپس آیا ہوں"
یہ سُن کر ایک صاحب نے کہا "پھر تو معانقہ ہوگا آج"
اب مصیبت یہ کہ معانقہ وہ نہ جانتے تھے لہذا کچھ سنّاٹے میں آگر رہ گئے کہ اللہ جانے یہ کس بات کی فرمائش ہوئی ہے۔ آخر بڑے پس و پیش کے بعد بولے :-
"جیسی آپ کی مرضی"

اسی قسم کا ایک حادثہ ابھی پنڈت جواہر لال نہرو پر گذرا ہی کہ وہ ایک قصباتی کانگریس کمیٹی کے جلسہ میں شرکت کے لئے گئے تو کانگریس کمیٹی کے صدر نے ان کا سواگت کرتے ہوئے کہا کہ "اب میں جواہر جی سے پرارتھنا کرتا ہوں کہ وہ اپنا بھاشن دیں تا کہ ہم سب لابھنونت ہوں"

پنڈت جی چکرا کر رہ گئے کہ وہ "لابھنجت" کرنا جانتے ہی نہیں تو کسی کو آخر کس طرح "لابھنجت" کر دیں۔ دیر تک بغلیں جھانکنے کے بعد آخر ان کو کانگریس کمیٹی کے ان ہی صدر صاحب سے پوچھنا پڑا کہ "آپ آخر کیا چاہتے ہیں کہ میں آپ کے ساتھ کیا کروں" اُن صاحب نے پنڈت جی کو سمجھایا کہ میرا مطلب یہ ہے کہ آپ ہم سب کو لابھنجت ہونے کا موقع دیں۔ پنڈت جی نے یقین دلایا کہ اگر میرے امکان میں ہوا اور کوئی قانونی رکاوٹ نہ ہوئی تو میں موقع ضرور دونگا مگر مجھے بتا تو دیجیے کہ آپ میرے ذریعہ لابھنجت کیونکر ہو سکتے ہیں یہ لابھنجت آخر ہے کیا۔ یہ سُن کر ان صاحب نے کہا "لابھنجت ہوں" سے میرا مطلب یہ تھا کہ "فائدہ اُٹھائیں" پنڈت جی تعجب سے اُن کا مُنھ دیکھ کر ہنسے اور کہا "اتنی سی بات کے لئے آپ نے خواہ مخواہ پریشان کر دیا تھا میں سوچ رہا تھا کہ نہ جانے مجھ سے کیا کرنے کو کہا جا رہا ہے۔

خیر پنڈت جواہر لال نہرو پر تو اس قسم کے حادثات اکثر گذرا ہی کرتے کرتے ہیں کہ مثلاً ان کی خدمت میں کسی جماعت نے کوئی ایڈریس پیش کیا اور اس میں نہ جانے کیا کیا لکھا گیا جو پنڈت جی کے قطعاً پلے نہ پڑ سکا اب آپ اس کا جواب دینے کھڑے ہوئے تو زیادہ سے زیادہ یہی کہہ سکے

کہ آپ نے میرے متعلق جو کچھ کہا ہے میں اس قابل تو نہیں ہوں مگر آپ کے نظرِ حسن کا شکر گذار ہوں۔ آپ نے اس ایڈریس میں جو مطالبات پیش کئے ہیں ان پر میں سمجھنے کے بعد غور کروں گا۔ اور اسی قسم کی گول مول جوابی تقریر کر کے وہ اس قسم کے امتحانوں سے گذر جاتے ہیں مگر پریشانی اس وقت ہوتی ہے جب وہ خود تقریر میں رہ رہ کر اردو کے الفاظ بولتے ہیں اور پھر اُن کی ہندی بنانا پڑتی ہے مثلاً ایک مرتبہ ان کی ایک تقریر ریلیے ہو رہی تھی اور وہ مسلسل ہکلا رہے تھے۔ دراصل وہ ہکلاتے نہیں ہیں مگر ہندی الفاظ یاد کر کے بولنے کے لئے ان کو ہکلانا ہی پڑتا ہے۔ کہنے لگے کہ:-

"میرے والد ــــ والد نہیں بلکہ پِتا جی ــ میرا مطلب ہے کہ میرے پِتا جی جو میرے والد تھے جب کبھی تقریر کرتے تھے۔ میرا مطلب ہے بھاشن دیتے تھے اس کو عوام۔ عوام تو میں غلط کہہ گیا میں کہنا چاہتا تھا جنتا اس لئے پسند کرتی تھی کہ اس میں ملک کی خدمت۔ یعنی گویا۔ میں کہنا چاہتا تھا دیس کی سیوا کی باتیں ہوتی تھیں۔"

اور اسی طرح وہ تقریر کے بجائے وہ ترجمہ کرتے رہے اور جو کچھ کہنا چاہتے تھے اس میں سے بہت سی باتیں اس لیے دل کی دل ہی میں رہ گئیں کہ بروقت ان کی ہندی نہ بن سکی۔ اسی طرح جب اُن سے شدھ ہندی میں بات کی جاتی ہے تو اکثر "نہیں" کی جگہ "ہاں" اور ہاں کی جگہ "نہیں"

کہہ جاتے ہیں ؎

وہ زمیں کی پوچھتے ہیں آسماں کہتا ہوں میں
جب سمجھ میں کچھ نہیں آتا تو ہاں کہتا ہوں میں

بے محل نہ ہوگا اگر مولانا کا ذکر کر دیا جائے جو ایک مرتبہ اپنے ایک عقیدت مند مرید کے گھر دعوت میں گئے۔ مرید اُن کو دیکھ کر بارے عقیدت کے دوڑا ان کے قدم چھوئے۔ مولانے اس کو روکا اور بڑی شفقت سے سمجھایا کہ قدم بوسی غیر اسلامی طریقہ ہے۔ البتہ دست بوسی کر سکتے ہو" اور جب مرید کی سمجھ میں نہ آیا تو آپ نے بتایا کہ "دست" ہاتھ کو کہتے ہیں" "دست بوسی" یعنی ہاتھ چومنا۔ مرید نے ہاتھ چومنے کے علاوہ گرہ میں یہ بات باندھ لی کہ ہاتھ کو دست کہتے ہیں تھوڑی دیر کے بعد مولانا نے فرمایا۔ "آب خنک منگاؤ۔ مرید مُنہ اُٹھائے کھڑا رہا کہ اللہ جانے حضور کون سی روحانی چیز مانگ رہے ہیں۔ مولانا کو پھر سمجھانا پڑا کہ "آب یعنی پانی۔ خُنک یعنی ٹھنڈا۔ میں ٹھنڈا پانی مانگ رہا ہوں"۔ مرید دوڑا پانی لانے کے لئے اور رٹا کرتا گیا کہ پانی کو آب کہتے ہیں اور ٹھنڈے کو خُنک تھوڑی دیر کے بعد اس نے دسترخوان چن دیا اور لوٹا لے کر کھڑا ہو گیا کہ ہاتھ دھلائے مگر یہی وقت تھا پڑھے ہوئے سبق کو دوہرانے کا لہٰذا اس نے عرض کیا کہ حضور

آب دست سے لیں۔" ظاہر ہے کہ مولانا کو پھر سمجھانا پڑا ہوگا کہ "آب دست ایک اور ہی چیز ہوتی ہے۔ مگر سب سے زیادہ مولانا اس وقت پریشان ہوئے جب کھانا کھانے کے بعد آپ نے ارشاد فرمایا۔" اب ذرا قیلولہ کا انتظام کردو۔" مرید سخت پریشان ہوا کہ اب یہ انتظام کس طرح کرے آخر اس کی سمجھ میں آگیا اور وہ سلفچی اور لوٹا لے کر حاضر ہو گیا کہ اسی سلفچی میں قیلولہ کر لیجیئے۔

قابلیت بگھارنے میں کوئی مضائقہ نہیں بشرطیکہ وہ کسی جاننے والے سے بگھاری جائے مگر مصیبت یہ ہے کہ عام طور پر لوگ ان ہی کو مرعوب کرنا چاہتے ہیں جو بات سن کر مفہوم ٹاپتے رہ جائیں اور بغلیں جھانکنے کے علاوہ جن کے پاس کوئی چارہ نہ ہو اور خدا نہ کرے کہ کسی جاہل کے ذہن میں ایک آدھ موٹا سا لفظ اٹکا رہ جائے تو اس کا مصرف ایسا نکالتا ہے کہ آپ چکرا کر رہ جائیں مثلاً ایک دن ایک صاحب اپنی بیوی کو ڈانٹ رہے تھے کہ "پان میں اتنی تماخو جھونک دی کہ پان کھاتے ہی دوران گفتگو شروع ہو گیا۔" بیوی تو اپنے شوہر نامدار کی قابلیت سے سہم کر رہ گئی ہوں گی مگر آپ کر لیجئے ان کا جو کچھ کر سکتے ہوں کہ دورانِ سر کو" دوران گفتگو کہہ رہے تھے۔

ستاروں کے آگے ــــــ ●

روس کے شمسی راکٹ کی کامیاب فلک پیمائیوں کے بعد سے چونکہ یہ تقریباً طے ہو چکا ہی کہ اب انسانوں کی پہونچ سیاروں اور ستاروں میں ہو کر رہے گی لہذا ہر طبقہ میں یہ سوال بڑی سنجیدگی کے ساتھ زیر غور آرہا ہی کہ ان سیاروں اور ستاروں میں جب ہم پہنچیں گے تو ہم کو وہاں کس قسم کی زندگی ملے گی۔ ایک عیسائی مشنری نے تو یہاں تک کہہ دیا ہی کہ جو لوگ ستاروں اور سیاروں کی طرف جائیں اُن کے پہلے ہی گروہ میں عیسائی مشنریوں کو ضرور جانا چاہیئے تاکہ ان سیاروں کی مخلوق پر تبلیغ کر کے ان کو راہ راست دکھائی جا سکے ایسا نہ ہو کہ بے راہ رو انسانوں سے مل جُل خدا کی راہ سے ہٹ جائیں اور چونکہ یہ روسی راکٹ ہوگا لہذا اس کا بھی امکان ہی کہ جس جس ستارے یا سیارے میں یہ پہونچے وہاں بے دینی

اور دھریت کا زور ہو جائے. اب عیسائی مشنریوں کے دیکھا دیکھی بہت سے دوسرے مذاہب کے مبلغ بھی یہ چاہیں گے کہ وہ پہلے پہونچ جائیں تاکہ عیسائی مشنری پہلے ہی اسے سب کو عیسائی بنا کر نہ رکھ دیں۔ صورت اب یہ نظر آ رہی ہے کہ ان سیاروں پر مختلف مذاہب کے مبلّغ جمع ہو کر مناظرے اور مباحثے شروع کر دیں گے اور وہاں انسانی جھل ہیل کی ابتدا سر کھٹول سے ہو گی۔

مذہبی مبلغین کی اس پیش قدمی سے سب سے زیادہ نقصان ہو گا. ان ممالک کے سیاست دانوں کا جہاں سیاسی ہنگامہ آرائیاں ممنوع قرار دے دی گئی ہیں۔ مثلاً ہمارے پاکستان ہی میں تمام سیاست داں بیکار بیٹھے ہوئے ہیں۔ تقریریں کرنے کو ترس رہے ہیں۔ جلوس نکلوانا اب خواب وخیال ہو کر رہ گیا ہے۔ کوئی ان کے ساتھ زندہ باد کا نعرہ تک بلند نہیں کرتا۔ نہ اخباری بیان دے سکتے ہیں نہ پوسٹر بازی کر سکتے ہیں۔ اس سناٹے سے گھبرا کر کسی نے شعر وشاعری شروع کر رکھی ہے۔ کوئی تاش کھیل کھیل جی بہلا رہا ہے۔ کسی نے کوئی کاروبار شروع کر دیا ہے۔ کسی نے اپنی پارٹی کے سائن بورڈ پر سفیدہ پھروا کر اپنا سائن بورڈ تیار کرا لیا ہے جس پر نام نامی اسم گرامی کے بعد صدر آل پاکستان انجمن وغیرہ وغیرہ کے بجائے اب لکھا

ہوا ہی بی۔ اے۔ ایل۔ بی۔ رو کیں۔ کسی جماعت کا سائن بورڈ کسی کباڑیے
کی دوکان پر ملتا ہی۔ تو کسی جماعت کے لیٹر پیپر پر دھوبی کا حساب یا
رمی کے نمبر لکھے ہوئے ملتے ہیں۔ ان حالات میں اگر سچ پوچھیے تو حق ان
ہی حضرات کا تھا کہ یہ کسی اور سیارے میں جاکر اپنی سیاسی پریکٹس شروع
کرتے مختلف سیاسی جماعتوں کے لوگ ہوتے سب اپنے اپنے مورچے
قائم کرتے۔ ایک دوسرے سے تُو تُو میں میں کرتے ایک دوسرے کو غدار
اور اپنے کو مخلص کہتے۔ کچھ الکشن بازیاں ہوتیں۔ کچھ حصول اقتدار کی کشمکش
ہوتی تو لطف بھی آتا۔

ایک فائدہ ان حضرات کے دوسرے سیاروں کی طرف جانے
سے یہ بھی ہوتا کہ ان کو وہاں جانے سے کوئی روکتا بھی نہیں یعنی سب ہی
کہتے کہ ع

بسفر رفتنت مبارکباد

بلکہ دوسرا مصرعہ بھی آدھا کہہ دیتے کہ "بسلامت روی" البتہ یہ کہتے کہ
"باز آئی"، بلکہ ان کو اسی شرط پر نئی دنیا بسانے کی اجازت دی جاتی کہ وہ
پھر اس طرف کا رُخ نہ کریں گے اور یہ حضرات خود بھی اس طرف رُخ کرنا
آخر کیوں چاہتے یہاں ان کے کشش ہی کیا باقی رہ گئی ہی کہ وہ یہاں آنا

یا یہاں سے جا کر واپس آنا چاہیں تو وہ خدا سے چاہتے ہیں کہ ان کو خدا کی اس کائنات میں کوئی گوشہ ایسا مل جائے جس میں وہ اپنے جلوس نکلوا سکیں۔ جس میں جلسے منعقد کر کے دھواں دھار تقریر کر سکیں اور جہاں اپنی لیڈری کے جھنڈے گاڑ سکیں، یہاں تو اُن مفلوج سیاست دانوں کا یہ عالم ہے کہ گویا ؎

پَر کتر کر مرے صیاد نے چھوڑا ہے مجھے
نام اس قید کا رکھا ہے رہا ہو جانا

اس زمین کا شاعر اقبال اب سے بہت پہلے کہہ گیا ہے کہ ؎

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں
ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں

چنانچہ اقبال کی اسی زمین سے جستجو کرنے والے ستاروں سے آگے کے جہاں ڈھونڈھتے ہوئے چاند سے آگے نکل چکے ہیں اور اب یہ طے ہو چکا ہے کہ کائنات کی تسخیر انسانی اختیارات سے باہر کی چیز نہیں ہے عنقریب وہ زمانہ آنے والا ہے کہ ہمارے بچے مریخ یونیورسٹی میں پڑھیں گے ہم اُن کو اپنی خیریت کے خط کبھی زہرہ سے لکھا کریں گے اور کبھی مشتری سے کہ الحمد للہ میں بخیریت ہوں اور تمھاری خیریت نیک مطلوب ہے لیکن

سرکاری کام سے ایک ہفتہ کے لیے شتری آیا ہوا ہوں والدہ تمھاری
چاند ہی میں اپنی کچھ سہیلیوں سے ملنے اتر گئیں۔ واپسی میں ان کو لیتا
ہوا دنیا کی طرف چلا جاؤں گا تم اپنی خیریت کا خط دنیا ہی کے پتہ پر بھیج دینا
سُنا ہے کہ آئندہ ماہ مریخ میں ایک کل کائناتی مشاعرہ ہو رہا ہے اور مجھ کو
بلایا جا رہا ہے اگر یہ درست ہے تو اس مشاعرے کے موقع پر تم سے
بھی ملاقات ہو جائے گی

جی ہاں اس قسم کے مشاعرے اب عام طور پر ہوا کریں گے۔ یہ ممکن ہے
کہ وہ اردو۔ فارسی یا عربی کے بجائے کسی کائناتی زبان میں ہوں اور مصرع
طرح کچھ اس قسم کا آیا کرے کہ۔ ع

آخ آخ آخ +½ ÷ ف غ چ × ؟

آپ کہیں گے کہ اس قسم کے مصرعہ طرح پر غزل کیونکر ہو سکے گی۔ یہ تو ہم کو بھی
فی الحال نہیں معلوم مگر یہ طے ہے کہ ہو گی شاعری کچھ اسی قسم کی اور دیئے
جائیں گے طبع آزمائی کے لئے اسی قسم کے مصرعے۔ اگر ہمارے شعرائے کرام
یہ چاہتے ہیں کہ ان کی شاعری یہ شکل اختیار نہ کرے تو اُن کو بھی چاہیئے کہ وہ
بھی ان ستاروں کی طرف جانے میں کسی سے پیچھے نہ رہیں تا کہ وہاں جا کر

شعروادب کے وہی چرچے شروع کرائیں جو وہ چاہتے ہیں مگر سناہو کہ بعض ستارے ایسے ہیں جنھیں تخلص کے بجائے دُم رکھنا پڑتی ہی۔ شروع شروع میں تو شرم آئے گی اُس دُم پر مگر جب سب ہی دمدار نظر آئیں گے تو یہ حجاب اُٹھ جائے گا۔ غرض مدعا یہ کہ شعرا کو بھی تکلف سے کام نہ لینا چاہیے ورنہ ان ستاروں کی ادبی فضائیں ان کے قابو سے باہر ہو جائیں گی۔

مشاعرے تو مشاعرے بہت سی ایسی شادیوں میں شرکت کرنا پڑے گی کہ ہم اپنی دنیا میں ہیں برات جارہی ہی زحل سے اور دُلھن کا گھر ہو عطارد میں مگر تعلقات کچھ اسی قسم کے ہیں کہ تقریب میں شریک ہونا بیحد ضروری ہے لہذا بیٹھیں گے راکٹ پر اور روانہ ہوجائینگے اور یہ سب سفر بس اسی قسم کے ہوا کریں گے جیسے آج کل ہم لوگ کراچی سے جیجا وطنی یا میاں چنوں کی طرف جاتے ہیں۔ اس وقت تو آپ اس کو مذاق سمجھ سمجھ رہے ہوں گے مگر چاند تک راکٹ کے پہونچنے پر بھی تو آپ ہنسا کرتے تھے اور بڑے تمسخر سے کہتے تھے

ع

ایں خیال است و محال است و جنوں

آخر انسانی تخلیق نے اس وہم کو واقعہ کر دکھایا یا نہیں۔ اگر یہ ہو سکتا
آخر انسانی تخلیق نے اس وہم کو واقعہ کر دکھایا یا نہیں۔ اگر یہ ہو سکتا
ہے تو باقی باتوں پر آپ کو تعجب کیوں ہے۔

ایک شکاری اور شکار

اللہ جانے ڈیوک آف اڈنبرا کو وہ بریانی زیادہ پسند آئی ہے جو
بیچ لکژری ہوٹل میں اُنھوں نے تناول فرمائی تھی یا وہ لوک نامی
زیادہ پسند آیا جو وزیر تجارت مسٹر بھٹو نے ان کو لارکانہ میں دکھا ہو
مگر ان دونوں سے زیادہ وہ ایک بیالیس مرغابیوں کے اخلاق سے
متاثر نظر آتے تھے جو مارے تواضع کے ان پر سچ قربان ہوگئیں اور پروانہ
وار ان کی بندوق کی نال کے سامنے آ کر نشانہ ہو گئیں۔ یہ اخلاق
ان کو یورپین مرغابیوں میں مشکل ہی سے نظر آیا ہو گا اور وہ یقیناً
پاکستانی مرغابیوں کے اس مہمان نوازی کو ہمیشہ یاد رکھیں گے کہ انھوں
نے بندوق اُٹھائی اور مرغابیاں کھنچ کھنچ کر نشانہ پر آنے لگیں کہ
اے مہمان عزیز۔ ع

رکھے گا کون تجھ سے عزیز اپنی جان کو

وہ تو کہیئے کہ شاہزادہ فلپ نے آزاد پاکستان کا دورہ کیا ہے ورنہ ۱۹۴۷ء سے پہلے تو یہاں یہ حال تھا کہ حکمراں قوم کا اگر کوئی شکاری شکار کے لئے نکلا تو اس کو یہ زحمت نہ ہوتی تھی کہ وہ شکار ڈھونڈھتا پھرے بلکہ شکار خود اس کی تلاش میں سرگرداں نظر آتا تھا اور جہاں صاحب کو دیکھا سر جھکا کر کھڑا ہو گیا کہ لیجیئے حضور میں حاضر ہوں جی چاہے خود گولی چلا دیجیئے ورنہ مجھے بندوق دیجیے میں خود کشی کر لوں۔ صاحب لوگوں کے لئے ان کے دیسی ماتحت شکار کا ایسا انتظام کرتے تھے کہ جنگل میں منادی کر دی جاتی تھی کہ سے

سینہ خالی کنید از دل ہا یار بہر شکار می آید

چنانچہ ایک مرتبہ ایک صاحب بہادر نے ریچھ کے شکار کا شوق ظاہر فرمایا اب مصیبت یہ تھی کہ جس علاقہ میں وہ شکار کھیلنا چاہتے تھے وہاں ریچھ ہوتا ہی نہ تھا مگر شعار اور اطاعت گزار ماتحتوں نے ریچھ کے شکار کا انتظام کر دیا اور صاحب بہادر شکار کھیلنے پہونچ گئے۔ جنگل میں تھوڑی ہی دور گئے ہوں گے کہ ایک جھاڑی سے ریچھ نکل کر سامنے آ گیا اور صاحب نے جو اُس پر بندوق اُٹھائی تو وہ دونوں ہاتھ اُٹھا کر دونوں پیروں پر

کھڑا ہو گیا اور لگا چھما چھم ناچنے۔ غلطی ہو گئی تھی کہ صاحب کے ماتحت افسروں نے ریچھ والے سے ریچھ تو خرید لیا مگر اس کے پیروں سے گھنگرو اور گردن سے کوڑیاں اتارنا بھول گئے۔ لہذا یہ بھانڈا پھوٹ گیا۔

خیر یہ تو دور غلامی کا ذکر ہے مگر پاکستان بنجانے کے بعد بھی اس حد تک تو ہوا ہو کہ الحاج خواجہ ناظم الدین صاحب بحیثیت گورنر جنرل کے جب لاہور تشریف لے گئے تو اُن کو نیشنل گارڈ کی ریلی کی سلامی لینے قصور بھی جانا تھا لہذا پروگرام یہ بتایا گیا کہ وہ بٹیروں کا شکار بھی قصور میں کھیلیں اس کے بعد سلامی لیں چنانچہ کچھ نہ پوچھیے کہاں کہاں سے بٹیریں لا لاکر اس جگہ چھوڑی گئیں جہاں گورنر جنرل کو شکار کھیلنا تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ بٹیریں بلٹیر بازوں سے حاصل نہ کی گئی ہوں گی اور نہ چڑیا بازار سے خریدی گئی ہوں گی مگر ہفتوں پہلے سے چڑی ماروں کو مصروف رہنا پڑا ہوگا تاکہ وہ زیادہ سے زیادہ تعداد میں بٹیریں پکڑ پکڑ کر جمع کریں اور اس رات اس علاقہ میں چھوڑ دیں جہاں صبح کے دھندلکے میں گورنر جنرل شکار کھیلنے آنے والے تھے۔

ہمارا مطلب یہ نہیں ہو کہ شاہزادہ فلپ نے جو ایک سو بیالیس مرغابیاں

شکار کی ہیں وہ بھی اسی طرح خرید کر اور پکڑوا کر وہاں اچھالی گئی ہوں گی، اگر یہ صورت ہوتی تو ان کی تعداد صرف ایک سو بیالیس نہ ہوتی بلکہ ایک ہزار ایک سو بیالیس ہوتی۔ شاہزادہ فلپ کے لئے اب اس اہتمام کی کیا ضرورت ہو وہ نہ حکمراں کی حیثیت سے آئے ہیں نہ لارڈکانہ کے مقامی حکام کو اس کی ضرورت تھی کہ مرغابیوں کا پہلے سے انتظام کر رکھیں ورنہ ممکن ہو کہ صاحب ناراض ہو کر ان کا ریکارڈ خراب کر دیں۔ یہ شکار تو صحیح معنوں میں شکار ہی کی حیثیت رکھتا ہو اور اس میں صرف وہی مرغابیاں شکار کی گئی ہیں جن کی قسمت میں یہ اعزاز لکھا تھا کہ وہ ایک عظیم سلطنت کی ملکہ کے شوہر کے نشانہ پر آ کر ماری جائیں اور مرغابیوں کی تاریخ میں زندہ جاوید بن جائیں۔ البتہ اس شکار کا اہتمام کرنے والے خوش ضرور ہوئے ہوں گے کہ ان مرغابیوں نے ان کو شرمندہ نہ ہونے دیا اور بحیثیت مجموعی یہ شکار کامیاب ضرور رہا۔

اس شکار کے بعد ہمارے وزیر تجارت مسٹر بھٹو نے ڈیوک آف اڈنبرا کو جو ڈنر دیا ہو وہ تو ظاہر ہو کہ پر تکلف ہوگا اور اس میں وہ بریانی بھی ہوگی جو ڈیوک کو بے حد مرغوب ہو مگر اس ڈنر کے بعد اُن کو جو لوک ناچ دکھایا گیا ہو وہ اللہ جانے ڈیوک کس حد تک سمجھے اور اس کو کتنا پسند کیا۔ اگر

موقع پرہم کو ڈیوک کے" ددیاخسر شاہ جارج پنجم کا ایک واقعہ یاد آرہا ہے کہ جب وہ دِلّی دربار کے موقع پر ہندوستان تشریف لائے تو علاوہ دوسری تقریبات کے اُن کے لئے دس منٹ کا ایک پروگرام ہندوستانی موسیقی کا بھی رکھا گیا تھا چنانچہ وقت مقررہ پر بادشاہ سلامت کو اس جگہ لایا گیا جہاں یہ پروگرام ہونے والا تھا اور اس پروگرام کو پیش کرنے کے لئے سازندوں نے ساز ملانا شروع کئے۔ سارنگی نواز نے سارنگی کو ٹُنٹنا ٹُنٹنا کر کھُونٹیاں اینٹھنا شروع کیں طبلہ نواز نے ہتھوڑی سنبھالی اور طبلہ پر اُنگلیاں اور ہاتھ مار مار کر اس کو درست کرنا شروع کیا۔ ایک استاد نے سارنگی اپنے زانو پر لٹا کر اس طرح ملانا شروع کی جیسے کوئی شفیق ماں اپنے شیر خوار بچے کو دودھ پلاتی ہے۔ اسی "ٹن ٹن، کھٹ کھٹ اور دھب دھب" میں دس منٹ گذر گئے اور بادشاہ سلامت اسی کو ہندوستانی موسیقی سمجھ کر سر دُھنتے ہوئے اور "ونڈرفل۔ ایکسیلنٹ" وغیرہ کہتے ہوئے وہاں سے اُٹھ گئے۔ اُن کو کیا پتہ کہ یہ تو صرف ہندوستانی موسیقی کا دیباچہ تھا اور تان پلٹے تو اس کے بعد شروع ہونے والے تھے۔ خدا کرے اسی قسم کا لوک ناچ ڈیوک نے لاڑکانہ میں نہ دیکھا ہو۔

قصہ دراصل یہ ہے کہ اس قسم کے مہمانوں کی تواضع کا طریقہ بدلنے کی اشد ضرورت ہے۔ وہ یہاں اس لئے نہیں آتے کہ ہم اُن کو اُن ہی نقالی کرکے دکھائیں وہی انگریزی کھانے کھلائیں جن سے بہتر وہ خود کھاتے رہتے ہیں وہی فیشن ایبل تماشے دکھائیں جو وہ دیکھ دیکھ کر تھک چکے ہیں ہم کو چاہیے کہ ہم ان کو اپنے کھانے کھلا کر اور اپنے باورچیوں اور رکابداروں کے کمالات دکھا کر اپنے کلچر کا اُن سے اعتراف کرائیں اعتراف کرائیں۔ اپنے فنونِ لطیفہ کے نمونے ان کے سامنے پیش کریں مثلاً اُن کو ایک خالص فرشی محفل میں لا کر مسند پر گاؤ تکیے کے سہارے بٹھایا جاتا، پیچوان اور خاصدان پیش کیا جاتا اور پھر باقاعدہ مجرا دکھایا جاتا۔ اُن کو کسی مشاعرے میں شرکت کا موقع دیا جاتا۔ ان کو بٹیروں یا مرغوں کی پالی کی سیر کرائی جاتی ان کو کبڈی کا موقع دیا جاتا۔ ان کو بٹیروں یا مرغوں کی پالی کی سیر کرائی جاتی۔ اُن کو کبڈی کا میچ دکھایا جاتا۔ اُن کو قوالی سنائی جاتی، ان کو پٹے بازی کے کمالات دکھائے جاتے۔ ان کو ہیر سنوائی جاتی ان کو بولیاں سنوائی جاتیں۔ ان کو نرت دکھا کر اسکی فنی باریکیاں سمجھائی جاتیں اور اسی طرح کی بہت سی ایسی چیزیں تھیں جو اُن کے لئے نئی ہوتیں۔ اب مثلاً وہ بریانی کھا کر جھوم اُٹھتے کاش ان کو رساول اور بالائی پیش کی جاتی تاکہ بھول جاتے وہ ہر قسم کی انگریزی پوڈنگ سرسوں کا ساگ اور مکئی کی روٹی چکھائی جاتی

تو ملکہ سے جا کر تعریف کرتے ۔ خیر آئندہ سہی ۔

ہم تو کام سے ہٹ گئے

کتنی سچی بات کہی ہے حضرت اکبر الٰہ آبادی مرحوم نے کہ ؎

اکبر ڈرے نہیں کسی سلطاں کی فوج سے
لیکن شہید ہو گئے بیگم کی نوج سے

یہ واقعہ ہے کہ بڑے بڑے شیر افگن اور کوہ شکن مردوں کو جو توپوں کے سامنے سینہ تان کر کھڑے رہے گولیوں کی بارش سے نہاتے رہے اور گھمسان کی لڑائی میں موت سے کھیلتے رہے عورت کے ایک خنجر ابرو سے ہلاک ہوتے ہوئے دیکھا ہے۔ وہ جن کو ملک الموت بھی مارنے سے عاجز رہا اس وقت مر سکے جب خود ملک الموت کو کسی قتالۂ عالم کے روپ میں آنا پڑا اور تیر نظر سے ان سخت جانوں کو ہلاک کرنا پڑا۔ بڑے بڑے شمشیر زنوں کے بازو شل ہو گئے ایک سے ایک تیر انداز کا نشانہ غلط ثابت ہوا۔

جو وار کیا وہ اوچھا پڑا اگر ایک نگاہ غلط انداز نے اسی جاں باز کو ایک ہی وار میں ایسا مارا کہ پھر اس نے پانی نہ مانگا۔ یہی وجہ ہے کہ جنگ کے میدان میں علاوہ توپ بندوق اور دوسرے اسلحہ کے دشمن کی طرف سے خوبصورت عورتیں بھی اسلحہ کے طور پر اپنے حریف کو رام کرنے کے لیے بروئے کار لائی گئی ہیں اور تجربہ یہ ہوا ہے کہ ناز و ادا کی مار زیادہ کارگر ثابت ہوئی ہے توپ، اور بندوق کی مار کے مقابلہ میں۔

یوں دیکھیے تو یہ دھان۔ پان۔ نازک اندام عورت کسی کھیت کی مولی ثابت نہیں ہوتی۔ ایک قدم تو کمر ستر بل کھا جاتی ہے۔ ہوا کا جھونکا آ جائے تو لال ڈوپٹہ ململ کا ہی نہیں اڑتا وہ خود بھی اڑنے کے لیے پر تولنے لگتی ہے۔ خاک کی اس چٹکی کو اگر کوئی سورما پھونک بھی مار دے تو وہ اڑ جائے مگر یہ واقعہ ہے کہ ایک کا ایک تبسم ہزار ایٹم بموں سے زیادہ مہلک ثابت ہوتا ہے اس کی ایک نگاہ غلط انداز بڑے سے بڑے مرد میدان کو پسپا کر کے رکھ دیتی ہے۔ اس کی تیغ ابرو کا ایک ہی وار بڑے بڑے شمشیر جنگوں کو سپر انداختہ کر کے رکھ دیتا ہے اور یہ بات سمجھ دار اقوام نے تسلیم کر لی ہے کہ دنیا کی سب سے بڑی طاقت وہی نزاکت اور لطافت ہے جو نسائیت کو حاصل ہے تو پوں کی گرج اور کسی آواز سے سہمتی نظر آتی ہے تو وہ پازیب

کی جھنکار ہی ہے۔ یہ کمزوری دراصل وہ شہ زوری ہے جو بڑے بڑے سورماؤں اور جبّاروں سے پانی بھروا تی نظر آتی ہے خدا محفوظ ہی رکھے حسن کے حربوں سے کچھ پتہ نہیں چلتا کہ عورت اپنے کس داؤں سے شکست دے گی اور اس کا نقشۂ جنگ کیا ہے وہ مسکرا کر اپنا کام نکال لیتی ہے۔ تیوریوں پر بل ڈال کر بھی فاتح بن جاتی ہے۔ ٹھنک کر بھی خط غلامی لکھوا لیتی ہے اور اگر کوئی حربہ کارگر نہ ہو تو آنسو بہا کر تو ایسا ڈبوتی ہے مدمقابل کو کہ وہ لاکھ شناوری دکھائے مگر غرق ہو کر ہی رہتا ہے۔

عورت کی اسی "اشک آور گیس" سے اپنے کو بچانے کے لیے بھارت کی حکومت بمبئی نے سرکاری ملازمین کے لیے ایک قانون نافذ العمل کیا ہے کہ وہ اپنے مطالبات منوانے کے لئے کسی قسم کا کوئی مظاہرہ نہ کریں اور کوئی احتجاجی شکل اختیار نہ کریں۔ مثلاً بھوک ہڑتال، پیاس ہڑتال، قلم چھوڑ ہڑتال، پنسل توڑ ہڑتال وغیرہ اسی لئے کہ وہاں اس قسم کی ہڑتالیں آئے دن ہوتی رہتی ہیں مگر حکومت نے سب سے زیادہ زور اس بات پر دیا ہے کہ وہ عورتیں جو سرکاری ملازم ہیں وہ "آنسو نچوڑ" ہڑتال تو ہرگز نہ کریں اس لیے کہ وہ اپنے مطالبات منوا کر آتی ہیں خواہ

وہ جائز ہوں یا ناجائز۔ اور جب کچھ بس نہیں چلتا تو ٹسوے بہانا شروع کر دیتی ہیں ظاہر ہے کہ عورت کی آنکھ میں آنسو دیکھ کر اپنے اصول پر آہنی عزم کے ساتھ قائم رہنے والے بھی موم کی صورت میں گھلنا شروع شروع کر دیتے ہیں اور ان آنسوؤں کے سیلاب میں بہہ کر چلانا شروع کر دیتے ہیں کہ :۔

"ماں جی بس کرو ۔ بہن جی بس کرو ۔ بس پتری بس ۔ روک لے اپنے آنسو جو تو کہتی ہے وہی ہو جائے گا مگر پرماتما کے لئے یہ رونا دھونا ختم کر دے ۔"

اب آپ ہی بتائیے کہ ان حالات میں کسی قانون کا اپنی جگہ قائم رہنا کس قدر دشوار ہے۔ کیسے ہی اصول وضع کئے جائیں مگر وہ ان زنانہ آنسوؤں کے مقابلہ میں ریت کی دیوار ثابت ہوتے ہیں اور مرد ملازموں پر خواہ کیسا ہی رعب جما لیا جائے مگر جب کسی مرد آہن قسم کے افسر بالا کی خدمت میں کوئی دیوی جی اپنی ساڑھی کا آنچل درست کرتی ہوئی پہونچتی ہیں تو لاکھ یہ طے کر لے کہ یہ میرے امتحان کا پرچہ آرہا ہے اور میں اس میں کامیاب ہو کر رہوں گا چنانچہ وہ دیوی جی کے تبسم کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ دیوی جی کی بیچارگی کو خاطر میں نہیں لاتے جب

وہ اپنا انگوٹھا چباتی ہیں یا پیمایش داماں میں مصروف ہوتی ہیں اس وقت بھی وہ اپنے دھڑکنے والے دل پر پیپر ویٹ ہی رکھ لیتے ہیں مگر جب وہ دیوی جی اپنے ترکش کا آخری تیر آزماتی ہیں یعنی چشم فسوں ساز سے ایک موتی نکل کر مژگاں پر تھرتھراتا ہوا اور پھر رخساروں پر یہ موتی ڈھلکنا شروع ہوتے ہیں تو حاکم بالا نہایت تیزی سے "حکم کے غلام" بننا شروع کر دیتے ہیں۔ کسمساتے ہیں۔ پہلو بدلتے ہیں۔ اور آخر گھبرا کر اعترافِ شکست ہی کرتے بن پڑتی ہے کہ تم جیتیں ہم ہارے جو تم کہہ رہی ہو وہی ہوگا مگر اب یہ آنسو کسی طرح خشک کرو اور ہمارے حال زار پر رحم کھاؤ۔

عورت کی اس شہ زوری سے سب ہی واقف ہیں اور جانتے ہیں کہ سخت سے سخت معرکہ میں عورت نے اپنی آنکھ کے ایک آنسو میں نہ جانے کتنے ضابطے اور کتنے قانون ڈبو کر رکھ دیئے ہیں لہذا حکومت بمبئی نے خاص طور پر عورتوں کو منع کیا ہے کہ وہ اپنی بات منوانے کے لیے اپنے آنسو ہرگز استعمال نہ کریں۔ مگر سوال یہ ہے کہ یہ حکم امتناعی بھی اگر ان ہی آنسوؤں کی زد پر آگیا تو کیا ہوگا۔ اس حکم کے خلاف اگر کچھ دیویاں قطار باندھ کر حاکم بالا کے حضور جا پہنچیں اور ان سے کہیں کہ اس حکم کو واپس لو ورنہ ہم

روتے ہیں تو وہ حاکم بالا صاحب اپنے کو کس طرح اس دھمکی سے محفوظ رکھیں گے اور اگر سچ مچ وہ عورتیں رو دیں تو سوائے اس کے کہ خود بھی وہ رو دیں اور کیا کر سکیں گے؟

شادی۔ حماقت ہے

شادی کے بعد سے اس بات پر غور کرنے کی کچھ عادت سی ہوگئی ہے
کہ شادی کرنا کوئی دانشمندانہ فعل ہے یا حماقت! یعنی اگر یہ دانشمندی
ہے تو پھر بعض اوقات، اپنے بے وقوف ہونے کا بے ساختہ احساس
کیوں ہونے لگتا ہے۔ اور اگر یہ حماقت ہے تو اس حماقت میں دنیا کیوں
مبتلا نظر آتی ہے۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ اگر یہ کوئی غور کرنے کی بات تھی تو
شادی سے پہلے غور کیا ہوتا۔ مگر میرا خیال یہ ہے کہ غور کرنے کا شعور عام
طور پر شادی کے بعد ہی پیدا ہوتا ہے۔ ورنہ اس دنیا سے شادی کی
رسم کب فنا ہو چکی ہوتی۔ یہاں تک پہنچنے کے بعد ایک سوال اور
پیدا ہوتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ شادی ہو چکنے کے بعد اس پر غور کرنے سے فائدہ
ہی کیا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اس کا فائدہ ایک شادی شدہ انسان

کو تو خیر نہیں پہونچ سکتا۔ لیکن خلق اللہ کو فائدہ پہونچنے کا قوی امکان موجود ہے۔ جس طرح دنیا کے تمام تجربے حاصل کرنے والے بنی نوع انسان کے محسن ہیں۔ اسی طرح ہم شادی شدہ لوگ بھی آئندہ نسلوں کے محسن ہو سکتے ہیں۔ بشرطیکہ وہ نسلیں ۔ع

دیکھیں ہمیں جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو

یقیناً وہ عظیم المرتبت شخص ہم سب کا محسن تھا۔ جس نے سب سے پہلے زہر کھا کر مرنے کا تجربہ کیا اور دنیا کو زہر کے متعلق یہ شعور عطا کیا کہ اس کے کھانے سے آدمی مر جاتا ہے۔ چنانچہ ہم نے بھی شادی اس لیے کی ہے کہ غیر شادی شدہ ہم کو دیکھیں کہ شادی کرنے کے بعد انسان وہ ہو جاتا ہے جو ہم ہو گئے ہیں۔

شادی تو خیر ایک مستقل مبحث بلکہ ایک فن مکمل ہے۔ اس صحرا کا صرف ایک ذرّہ اور اس قلزم کا صرف قطرہ اس وقت موضوع بحث ہے۔ یعنی بیوی بھی نہیں بلکہ بیوی کے رشتہ دار، اب اگر آپ اس ذرے کی وسعتوں اور اسی قطرہ کی گہرائیوں پر غور کریں تو چیخ اُٹھیں گے۔

اسی قطرے میں دریا ہے اسی ذرے میں صحرا ہے۔ بیوی کے رشتہ دار ایک شادی شدہ انسان کے لئے عام طور پر سانپ کے مُنھ والی چھچھوندر ثابت ہوتے ہیں جن کو نہ اُگلا جائے نہ نگلا جا سکتا کہ وہ بیوی کے

رشتہ دار ہیں۔ اور نگلا اس لئے نہیں جا سکتا کہ اپنے رشتہ دار نہیں ہیں۔ اپنے رشتہ داروں کے متعلق ایک آدمی کو ہر وقت اُگلنے یا نگلنے کا اختیار حاصل رہتا ہے۔ اُن سے دل خوش ہے، طبیعت میل کھا رہی ہے۔ دل قبول کر رہا ہے تو تعلقات قائم ہیں، ورنہ بہانہ ڈھونڈھ کر لڑ لئے۔ وہ اپنے گھر خوش ہم اپنے گھر خوش، لیکن بیوی کے رشتہ داروں کے متعلق تو یہ گویا ایک طے شدہ بات ہے کہ اُن سے ہر حال میں تعلقات رکھنا ہیں۔ اُن سے خلوص کا اظہار کرنا ہے، ان کی مدارات میں دل، جگر اور آنکھوں کے فرش بچھا کر اُن پہ جذبات کے گاؤ تکیے لگانا ہیں۔ اگر وہ بڑے ہیں تو سعادت مندی کے ان کو وہ جوہر دکھانا ہیں جو خود اُن کی ذاتی اولاد سے ممکن نہ ہوں، اگر برابر کے ہیں تو محبت کا وہ اظہار کرنا ہے کہ بھی منافقت کے قائل ہو جائیں اگر چھوٹے ہیں تو اس قسم کی شفقت کرنا ہے۔ جس میں گستاخی کا کوئی امکان نہ ہو۔ البتہ اگر ادب کا پہلو نمایاں ہو جائے تو چنداں مضائقہ نہیں ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ اس قسم کی زبردستی اور نفس کشی سے ایک انسان کس حد تک جرائم پیشہ ہو جاتا ہے۔ یعنی اس کی اخلاقی جرأت فوت ہو جاتی ہے، ضمیر کی زبان پر فالج گر جاتا ہے۔ سچائی کے عالم میں آجاتی ہے۔ ایمانداری اختلاج میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ اور بحیثیت مجموعی وہ انسان اگر کچھ باقی رہ جاتا ہے تو صرف منافق، دروغ باف، اور ایک حد تک ڈرپوک بھی۔ لیکن کچھ بھی ہو

اگر اس کو بیوی پیاری ہے تو بیوی کے رشتہ داروں سے اچھے تعلقات رکھنا ہی پڑتے ہیں۔ خواہ دل ہی دل میں وہ خودکشی یا فرار کے امکانات پر کتنا ہی غور کیوں نہ کرے۔

بیوی کے رشتہ داروں کی بھی عجیب عجیب قسموں سے ایک بیوی والے کو دوچار ہونا پڑتا ہے۔ ان میں سے موت کا درجہ تو کم وبیش سب ہی کو حاصل ہوتا ہے۔ لیکن بعض ہوتے ہیں محض موت، بعض ناگہانی موت، بعض غریب الوطنی کی موت اور بعض ہر حال میں ملک الموت، محض موت تو خاص خاص لوگ ہوتے ہیں جن کا ایک انسان تقریباً عادی ہوجاتا ہے مثلاً بیوی کے والد، بھائی، ماں، خالہ، چچا، چچی، ماموں اور ممانی وغیرہ ناگہانی موت وہ رشتہ دار ہوتے ہیں جن کا کوئی علم ہی نہیں ہوتا بس دفتر سے آکر یہ معلوم ہوتا ہے کہ باورچی خانہ میں مرغ مسلم پک رہا ہے۔ نعمت خانہ میں فیرینی کے پیالے چنے ہوئے ہیں۔ اور گھر کے تمام نوکر پلاؤ سے کشتی لڑ رہے ہیں۔ دریافت کرنے پر پتہ چلتا ہے کہ خسر صاحب کے کوئی پھوپھی زاد بھائی جنوبی افریقہ سے تشریف لائے ہیں چنانچہ صحن میں قالین بچھے ہوئے، تخت پر گاؤ تکیہ سے لگے ہوئے حقہ پیتے اور پان چباتے ایک سندباد جہازی نظر آتے ہیں۔ جن کے سامنے بیوی صاحبہ پان پر پان اور الائچیوں پر الائچیاں رکھتی نظر آتی ہیں۔ مجبوراً نہایت ادب سے آداب عرض کرنا پڑتا

ہے۔ جس کے جواب میں یہ فرعون مصر فرماتے ہیں۔

"سلامت رہو میاں، آؤ بیٹھو، بڑی طبیعت خوش ہوئی تمھیں دیکھ کر برخوردار من یہ عجیب طریقہ ہے تمھارے یہاں کا کہ صبح سے غائب اب آئے ہو شام کو۔"

عرض کیا کہ "دفتر کے اوقات کچھ ایسے ہی ہیں۔"

نہایت رعونت سے فرمایا "دراصل ملازمت غلامی کا دوسرا نام ہے۔ ہمارے خاندان میں سب تجارت پیشہ ہیں۔ اب یہ ان لڑکیوں کی قسمت تھی" کہ ان کو ملازمت پیشہ بر ملے۔ اور دراصل تجارت کا کہنا ہی کیا۔ انسان بادشاہی کی حد تک ترقی کر سکتا ہے۔ جنوبی افریقہ میں تمہاری دعا سے پہلے ایک چائے اسٹال تھا میرا، اب دو ہوٹل ہیں اور خوب چل رہے ہیں۔ بھائی صاحب کو دیکھو، یعنی اپنے خسر کو لیس بیل فیتہ وغیرہ بیچتے تھے مگر اب خدا کے فضل سے محض دو دکان کا کرایہ دیتے ہیں۔ آٹھ روپیہ ماہوار تو مطلب یہ کہ تجارت کچھ اور ہی چیز ہے۔ بہر حال کیا تنخواہ ملتی ہے۔

عرض کیا "پچاسی روپے!"

نہایت حقارت سے ان بساطی کے بھائی ہوٹل والے صاحب نے فرمایا۔ "اس قدر آمدنی تو ایک تانگہ رکھ کر اور کرایہ پہ چلا کر بھی ہو سکتی ہے" اب بیوی کو جو رحم طلب نظروں سے دیکھا تو وہ گویا اپنے افریقین چچا جان

کی تائید میں تھیں نتیجہ یہ ہوا کہ زہرہ گھونٹ پی کر اور ان کے ساتھ مرغ پلاؤ اور فیرینی کھا کر رہ گئے

ایک تو آئے دن کی مصیبت یہ ہے کہ سوسائٹی میں ہر وقت کے طعنے ہیں کہ سنیئے جناب آپ کے خسر تو بڑے گراں فروش ہو گئے ہیں سیپ کے بٹن تمام دنیا میں چار آنے درجن مل رہے ہیں، اور وہ دیتے ہیں پانچ آنہ درجن، اب کون ان پڑھے لکھے دوستوں کو سمجھائے کہ بھائی ان کو گھما پھرا کر بساطی نہ کہو۔ ملک التجار کہو، بہر حال اس قسم کی باتوں کی تو خیر عادت پڑ جاتی ہے۔ مگر یہ بھانت بھانت کے ناگہانی رشتہ دار جو ٹپکتے رہتے ہیں ان کا آخر کیا علاج۔ اور ان سے بھی زیادہ لا علاج وہ قسم ہے جس کو غریب الوطنی کی موت عرض کیا ہے۔ بیوی کے یہ رشتہ دار غربت میں بہت ستاتے ہیں۔ فرض کر لیجیے کہ آپ بسلسلۂ ملازمت یا بسلسلۂ شامت کہیں باہر گئے ہوئے ہیں۔ بڑے لئے دیئے بیٹھے ہیں۔ دل مطمئن ہے کہ یہاں کسی کو یہ خبر نہیں کہ ہم بساطی کے داماد ہیں۔ کہ یکایک ایک صاحب داڑھی چڑھائے لٹھ ہاتھ میں لیے چوروں کی سی وضع قطع تشریف لے آئیں گے اور اتنی زور سے السلام علیکم کریں گے کہ آپ اچھل پڑیں۔ اب وہ گل افشانی شروع کر دیں گے۔ کہ ارے بھائی یہاں آئے اور خبر تک نہ کی۔ ہم لاکھ غریب ہیں۔ مگر پھر بھی تم ہمارے دل و جگر ہو۔

میں تمھارے خسر صاحب کی حقیقی خالہ کا داماد ہوں۔ اس قدر قریب کے عزیز اور یہ بیگانگی اور جو یہ کہو کہ میرا پتہ نہ تھا تو میاں یہ بات میں ماننے کا نہیں، اسٹیشن پر جس تانگہ والے سے پوچھ لیتے کہ بھائی تمھارے چودھری کہاں رہتے ہیں وہ پتہ بتا دیتا۔" اب بتائیے کہ ان چودھری صاحب کے پردیسی داماد کا سارا وقار اس غریب الوطنی میں کس کی بغلیں جھانکتا پھرے اور جو سکہ یہاں جمانا چاہتے تھے اس کی کھوٹ معلوم ہو جانے کے بعد اپنی قیمت کیونکر قائم رکھی جائے۔

خیر یہ صورتیں تو ایسی حالت میں پیدا ہوتی ہیں کہ آدمی ضعف بصر کے ماتحت یا تو اپنے سے پست درجہ کے لوگوں سے سسرالی تعلقات پیدا کرلے یا دماغ کی خرابی کے ماتحت بلا وجہ خود اپنی اصلیت چھپا رہا ہو۔ اور وہ اس طرح بے نقاب ہوتی ہو۔ لیکن ایسی صورتیں اگر نہ بھی ہوں تو سسرالی رشتہ دار کچھ عجیب خدائی فوجدار قسم کے لوگ تو ضرور ہی ثابت ہوتے ہیں ہمدردی وہ اس لیے نہیں کر سکتے کہ اپنے نہیں ہوتے اور نکتہ چینی اس لیے اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ ہم ان کی ایک عزیزہ کے نہایت خاص قسم کے رشتہ دار ہوتے ہیں۔ یعنی وہ اچھی طرح ٹھونک بجا کر اس قابل تو سمجھ لیتے ہیں کہ اپنی عزیزہ کی شوہری کے اعزاز سے ہم کو سرفراز کر دیں۔ مگر یہ اندیشہ ان کو قدم قدم پر رہتا ہو کہ ممکن ہو ان کی نظر انتخاب نے دھوکا کھایا ہو۔ بہرحال پہلے تو وہ

رسمی طور پر اپنی عزیزہ کا شوہر بنا دیتے ہیں۔ اس کے بعد عملی طور پر گویا شوہر بننے کی ٹریننگ دیتے رہتے ہیں۔ شوہر غریب، نسبت سے لیکر شادی تک اور شادی سے لے کر موت تک یہی سمجھتا رہتا ہو کہ اس نے اپنے کو صرف ایک ہستی سے وابستہ کیا ہو۔ لیکن اُس کی یہ غلط فہمی طرح طرح سے دور کی جاتی ہو اور اس کو بتایا جاتا ہو کہ نکاح تو صرف ایک سے ہوا۔ مگر نباہ اُن سب سے کرنا ہو جو کسی نہ کسی حیثیت سے بیوی کے رشتہ دار ہیں یا ہو سکتے ہیں یا سمجھے جا سکتے ہیں۔ یا سمجھے جانے کا کوئی بھی امکان موجود ہو۔ ان رشتہ داروں سے نباہ بھی مر کھپ کر گوارا کر لیا جائے۔ مگر ہوتا عام طور پر یہ ہے کہ نباہ اخلاقی، تمدنی، معاشرتی، اقتصادی اور معاشی ہر حیثیت سے اول تو ناممکن ہوتا ہو۔ اور اگر ممکن بنا بھی لیا جائے تو بہت گراں رہتا ہو۔ مثلاً اخلاقی حیثیت سے یوں گراں ثابت ہوتا ہو کہ ان کی ہر بد اخلاقی کو سراہنا آخر کیوں کر ممکن ہو۔ تمدنی اور معاشرتی حیثیت سے یہ نباہ اس لیے گراں بیٹھتا ہو کہ اپنا تمدن اور اپنی معاشرت چھوڑ کر ان کے رنگ میں رنگ جانا اول تو ایک قسم کی زن مریدی ہو۔ دوسرے یہ بھی کوئی ضروری بات نہیں کہ وہ تمدن اور وہ معاشرت قابل قبول بھی ہو۔ فرض کر لیجیے کہ وہ لوگ پہلوان ہیں۔ اب بتائیے کہ ہم اپنی معاشرت میں ڈنڑ اور مگدر کیوں کر شامل کر سکتے ہیں۔ اقتصادی حیثیت کا پوچھنا ہی کیا جتنی تقریبیں، شادیاں۔ کن چھیدن، دودھ بڑھائی۔ سوچھوچھو

کونڈے، منگنیاں اور حد یہ ہے کہ موتیں ان سسرالی رشتہ داروں
میں ہوتی ہیں۔ اتنی اپنے رشتہ داروں میں کبھی نہیں ہوتیں اس لیے
کہ اپنے رشتہ دار تو گنے گنائے محدود ہوتے ہیں۔ مگر ان سسرالی رشتہ
داروں کا تو کوئی شمار نہیں ہوتا۔ پھر یہ کہ ہر تقریب میں بیوی کا جانا
اور شوہر کا اس سلسلہ میں مقروض ہونا برحق ہوتا ہے۔ تاکہ سسرال میں
بات بنی رہے۔ خواہ مہاجن بات کا بتنگڑ بنائے۔ معاشی حیثیت کا
ذکر میں نے اس لئے کیا ہے کہ بہت سے داماد قسم کے مینم لوگ یا تو سسرالی
پیشہ اختیار کرنے پر مجبور کر دیئے جاتے ہیں۔ یا کم سے کم سسرالی بزرگوں
کے مشورے سے کسی ملازمت سے مستعفی ہونے یا کسی ملازمت کی امیدواری
کرنے کا فیصلہ ضرور کرتے ہیں۔ ان تمام امور کے علاوہ ایک سب سے
بڑی بات یہ بھی ہوتی ہے کہ سسرالی رشتہ داروں کی بتلیغ سے اپنے
رشتہ داروں سے آدمی دور ہو جاتا ہے۔ خیریت اسی کو سمجھئے کہ امن و
سکون سے تعلق ختم اور وہ استوار ہوتا ہے۔ ورنہ اس سلسلہ میں فوجداری یا
تک نہ بکھی او رسنی ہیں اور کیا عجب ہے کہ کبھی ان ہی فوجداریوں کی ذاتی
طور پر نوبت آجائے اس لئے کہ لاکھ سمجھدار سہی مگر پھر بھی آخر شادی شدہ
تو ہم ہیں ہی۔!

دنیا کیا سے کیا ہو جائیگی

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آسکتا نہیں
محو حیرت ہوں کہ دُنیا کیا سے کیا ہو جائیگی

اچھا خاصا شعر ہے۔ مگر دُنیا اس حد تک کیا سے کیا ہو چکی ہے کہ اب یہ شعر بھی آثار قدیمہ کی حیثیت سے اچھا معلوم ہو سکتا ہے۔ ورنہ آج کل محو حیرت ہونے کی فرصت کسے ہے اور نہ دراصل حیرت کی کوئی بات ہے۔ ہاں جسوقت کا یہ شعر ہے۔ اس وقت حیرت ضرور ہوتی ہوگی۔ اور لوگوں کے پاس حیرت کرنے۔ تصوّر جاناں میں بیٹھے رہنے یا محض اونگھنے کے لیے بھی وقت کافی تھا۔ اب تو زمانہ کی رفتار اس قدر تیز ہے کہ اس قسم کے تفصیلی مشاغل کے لئے وقت ہی نہیں ملتا۔ ہمارے بزرگ آنکھ سے جو کچھ دیکھتے تھے اسپر پہلے تو اطمینان سے محو حیرت ہو جایا کرتے تھے۔ پھر ٹھنڈے دل سے غور

کرتے تھے۔ کہ جو کچھ دیکھا ہے وہ لب پر لائیں یا نہ لائیں اس کے بعد
اپنے ہمجھوں سے مشورہ کرتے تھے کہ بھئی میرن صاحب کیا عرض کیا
جائے۔ میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ مگر سوچ رہا ہوں کہ کہوں یا نہ کہوں۔
یعنی کہوں تو کس زبان سے اور نہ کہوں تو کیونکر۔ میرن صاحب کے پاس
بھی وقت کافی ہوا کرتا تھا۔ چنانچہ وہ جھوم کر جواب دیتے تھے کہ :-
سبحان اللہ کیا بات فرمائی ہے۔ آپ نے اس کے متعلق ایک فارسی
کی ضرب المثل یاد آ گئی "گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل۔ مگر جناب بندہ تو
اسی کا قائل ہے کہ ؎

ہوتی ہے گرچہ کہنے سے یارو پرائی بات
پر ہم سے تو کبھی نہ کسی منہ پہ آئی بات

میرن صاحب کے اس تفصیلی جواب پر یہ بزرگ پھر غور و فکر میں مبتلا
ہو جایا کرتے تھے اور حُقّے سے بہت دیر تک شغل فرمانے کے بعد نہایت
آہستگی سے فرماتے تھے کہ "کیا کہوں کچھ کہا نہیں جاتا۔ اور بھئی میرن صاحب
بن کہے بھی رہا نہیں جاتا۔ میں تو دنیا کے یہ رنگ دیکھ کر دم بخود ہوں
اپنے ہی گھر میں وہ نقشہ دیکھ رہا ہوں کہ آنکھوں کا اعتبار اُٹھ گیا ہے
عینک لگا کر دیکھتا ہوں تو اور بھی آنکھیں پھوڑ لینے کو دل چاہتا ہے
جو کچھ آنکھیں دکھا رہی ہیں۔ یقین جانیے کہ بیان نہیں کر سکتا۔ میرن صاحب

فوراً ازانو سپیٹ کر فرماتے تھے "ذرا ٹھہریئے گا حضور والا۔ آپ نے آمد ہی آمد میں ایک شعر کہہ دیا دیکھیے۔ ہوں۔ ہوں۔ آنکھ جو کچھ۔ ہوں۔ لب۔ ہاں ٹھیک ہے۔ ملاحظہ فرمائیے حضور مصرعہ ہوا ہے۔ ہیلے ہیلے ہیلے۔ سنیئے

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پر آسکتا نہیں

مصرعہ سنتے ہی یہ بزرگ محترم آپے سے باہر ہو جایا کرتے تھے۔ بھئی کیا بولتا ہوا مصرعہ موزوں کیا ہے۔ کیا کہنا ہے۔ میرن صاحب اس کو کہتے ہیں حاضر دماغی، اور بھئی مصرعہ دیتا ہوں اس پر۔ تھیں میری قسم منو کیا برابر کا مصرعہ ہوا ہے ؎

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پر آسکتا نہیں اور بھئی

محو حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائیگی

باتوں ہی باتوں میں دونوں بزرگوں نے شعر کہہ لیا۔ رہ گئی کام کی بات وہ حیرت میں گم ہو کر لب پر آ ہی نہ سکی۔ مگر ان بزرگوں کی حیرت کے احترام میں دنیا اپنی جگہ قائم نہ رہ سکی اور وہ کیا سے کیا ہو ہی گئی اور اس حد تک کیا سے کیا ہو گئی کہ اب ان ہی بزرگوں کے خردوں کو محو حیرت ہونے کے لئے ذرا سا بھی وقت نہیں ملتا۔ پہلے حیرت اور محویت کے جو ذرایع ہمارے بزرگوں کو حاصل تھے۔ اب وہی نہیں ہیں تو حیرت اور محویت کہاں سے نصیب ہوا۔ آپ ہی غور فرمائیے کہ مونڈھ

یا بائیسکل پر بیٹھ کر یا موٹریں اور بائیسکلیں چلنے والی سڑکوں پر چل کر کوئی کیوں کر محویت یا حیرت کے شوق کو پورا کر سکتا ہے۔ ذرا اسی محویت طاری کیجیے تو فوراً حادثہ ہو جائے۔ خود کچل جائیے یا کسی کو کچل دیجیے۔ دراصل اسی قسم کی محویت اور حیرت کے سدباب کے لیے بڑے بڑے شہروں میں ٹریفک پولیس کا انتظام سرکار کی طرف سے کیا گیا ہے۔ ہمارے بزرگوں کے وقت میں نہ یہ پابندیاں تھیں نہ یہ فراٹے بھرتی ہوئی موٹریں۔ وہ نہایت اطمینان سے بیل گاڑی پر بیٹھ کر جتنا دل چاہتا تھا محو رہتے تھے۔ جس قدر جی چاہتا تھا اپنے اوپر حیرت طاری کر لیتے تھے۔ گنگناتے تھے۔ شعر کہتے تھے۔ اونگھتے تھے اور سفر بھی طے ہوتا رہتا۔ بلکہ ان کی گاڑیوں میں جتے ہوئے بیل تک اعلیٰ درجہ کے مفکر اور شاعر نظر آتے تھے۔ لوگ کہتے ہیں کہ میر سا شاعر پھر نہ پیدا ہوا۔ غالب پر کوئی غالب نہ آسکا اب کون سمجھائے ان حضرات کو کہ جناب والا میر نے ریلوں اور موٹروں پر بیٹھ کر شعر نہیں کہے ہیں۔ غالب کسی دفتر میں کلرک یا کسی رسالہ کے ایڈیٹر نہیں تھے۔ وہ شاعر تھے اور محض شاعر، شاعر گھروں میں بیٹھ کر شعر کہتے تھے بیل گاڑیوں پر بیٹھ کر شعر کہتے تھے۔ راتیں اپنی تھیں۔ دن اپنے تھے وقت اپنا تھا۔ فرصتیں اپنی تھیں، گاڑی اپنی تھی، اور بیل اپنے تھے کجا وہ فرصتوں میں ڈھلے ہوئے اشعار کجا یہ شعر کہ بائیسکل پر بیٹھے گھڑی

دیکھتے دفتر کی طرف جا رہے ہیں۔ نظریں ہیں ٹریفک پولیس کے اشاروں پر کان لگے ہیں موٹروں کے ہارن پر، دل دھڑک رہا ہو اس خیال سے کہ کسی موٹر کی جھپیٹ میں نہ آجائیں یا بائیسکل کی لپیٹ میں کوئی راہگیر آجائے۔ اور زبان کی نوک پر مصرعہ طرح بھی موجود ہو، شام کے مشاعرے کا، دفتر میں پہونچے تو سامنے فائیلوں کے ڈھیر اردگرد اہل غرض حضرات کا ہجوم اور سب کا الگ الگ مقصد، مصرعے دل و دماغ میں آنا چاہتے ہیں۔ مگر یہ منظر دیکھ کر بھڑک جاتے ہیں۔ بمشکل تمام جو مصرعے پھنس گئے اُن کو بلاٹنگ پیپر پر لکھ لیا۔ دن بھر اسی طرح مصرعے پھانسے، شام کو سب مصرعے جمع کر کے دو سے تقسیم کر دیئے۔ حاصل تقسیم ہوئی اشعار کی تعداد اور یہی اشعار جا کر مشاعرے میں سُنا دیئے۔ اب بتائیے کہ یہ اشعار یہ اشعار کیونکر میر اور غالب کا جواب ہو سکتے ہیں۔ میر اور غالب کو ان ہی حالات میں مبتلا کر کے کچھ کہلوائیے تو پتہ چلے کہ وہ خود بھی اپنے معیار پر پورے اُترتے ہیں۔ یا نہیں۔ مگر یہ بھی سچ ہو کہ ہر زمانہ اپنی ضروریات کو خود سمجھتا ہو۔ اور خود ساتھ لاتا ہو۔ فرصتیں تھیں تو طلسم ہوشربا لکھنے اور پڑھنے کا ذوق لایا فرصتیں محدود ہوئیں تو یہ ذوق ناول میں محدود ہو گیا فرصت اور محدود ہوئی تو ناول افسانہ بن گئی۔ فرصت اور ہوئی تو افسانہ بھی مختصر ہو گیا اسی طرح شاعری نے زمانے کے ساتھ چولے بدلے

فرصتیں مثنویاں کہلواتی تھیں۔ مصروفیتیں غزلیں کہلوانے لگیں۔ مصروفیت اور بڑھی تو غزلیں بھی ختم آزاد شاعری سہی۔ جس وقت جتنی فرصت ملے اتنا بڑا مصرعہ کہہ لیجیے، یہ نہیں کہ سب مصرعے برابر کے ہوں بعد میں سب کو یکجا کر لیجیے۔ ایک نظم ہو جائے گی۔ مثلاً آپ کو پانچ منٹ کی فرصت ہو تو آپ پانچ منٹ والا مصرعہ کہہ لیجیے۔

ع ہائے آغاز محبت کی وہ پہلی دھڑکن

پھر کسی وقت ایک منٹ کی فرصت ملی تو ایک منٹ والا مصرع کہہ لیا۔

ع جو ترے سینہ میں تھی۔

اسی طرح کبھی تین منٹ کی فرصت ملی۔ کبھی ڈھائی منٹ کی اور کبھی پونے چار منٹ کی، اسی مناسبت سے مصرعے ہوتے چلے گئے اور آخر میں جاکر اچھی خاصی نظم کچھ اس طرح کی تیار ہو گئی ؎

ہائے آغازِ محبت کی وہ پہلی دھڑکن

جو ترے سینہ میں تھی

وہ دھڑکتا ہوا دل

کچھ مچلتے ہوئے ارمان بھی تھے مہر بلب

یعنی خموش

اور آنکھوں کے دریچوں میں وہ جب بیٹھتی تھی۔

سیر کرنے کے لئے
گنبدِ عرش پہ تھے چاند ستارے لرزاں
خطِ سرطاں کی قسم
میں نے دیکھا ہے کہ خود کانپ رہی تھی تو بھی
ہائے آغازِ محبت کی وہ پہلی دھڑکن

اس نظم سے یہ بات ہر ایک کو معلوم ہو جائے گی کہ شاعری کوئی بیکار آدمی نہیں ہے۔ اس کو شاعری کے علاوہ دنیا میں اور کام بھی ہیں اور اس کے پاس اتنا فالتو وقت نہیں ہے کہ ہر مصرعہ کے لئے برابر کا وقت مہیا کرتا پھرے۔ مطلب ہے کہ نظم سے وہ مختلف قسم کے مصرعوں سے بھی مرتب ہو سکتی ہے۔ فی الحال اس قسم کی نظمیں کہنے کے لئے وقت مل رہا ہے۔ لیکن جب اتنا بھی وقت نہ ملے گا تو آج کل جو عنوان ہوا کرتا ہے وہی نظم کا درجہ حاصل کرے گا۔ مشاعرے میں اعلان ہوگا کہ اب شوکت تھانوی صاحب سے اُن کی نظم سنیئے، شوکت تھانوی صاحب واٹس پر آ کر فرمائیں گے۔ عرض کیا ہے۔ "اے بہار" مشاعرہ تالیوں کی گونج سے اُڑ جائے گا۔ اور شوکت صاحب سلام کرتے ہوئے اپنی جگہ پر آ جایا کریں گے۔

بہر حال آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے وہ آپ دیکھ لیجیے کہ اب لب پر بھی آ رہا ہے رہ گیا محوِ حیرت ہونا وہ اس لئے بیکار ہے کہ حیرت عادت بن کر رہ جائے تو

حیرت ہو کہ اس پر حیرت کی جائے۔ دُنیا کے کیا سے کیا ہونے کا جہانتک سوال ہے وہ اپنی مصروفیت سے باز نہیں آسکتی۔ ہمیشہ اس نے یہی کیا ہے۔ آئندہ بھی اُس کا یہی پروگرام ہو۔ پھر بڑی بوڑھیوں کی طرح ٹھنڈی سانس لے کر ہم یہ شعر کیوں پڑھیں۔ اور سوال تو یہ ہو کہ اس نئی شاعری کے زمانہ میں یہ پُرانا شعر پڑھنا ہے بھی تو بے وقت کی راگنی سوائے اس کے کہ آپ پڑھیں اور سننے والے ہنسیں، آپ اس ہنسی پر حیرت زدہ ہوں اور وہ آپ کی حیرت کا تماشہ دیکھیں اور تو کوئی صورت نظر نہیں آتی۔

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہو، کا سوال دراصل در پردہ شکایت ہو اس بات کی کہ آنکھ جو کچھ دیکھا کرتی تھی وہ نہیں دیکھ رہی ہو اور یہ واقعہ بھی ہے کہ جو کچھ ہمارے بزرگ دیکھا کرتے تھے۔ وہ اب ہم کو نظر نہیں آرہا ہو۔ اور جو کچھ ہم دیکھ رہے ہیں وہ ہمارے بچے شاید ہی دیکھ سکیں۔ مثلاً ہماری آنکھ آج کل چشمہ دیکھ رہی ہو۔ ہمارے بزرگوں نے یہ چیز بہت کم دیکھی تھی اور ہمارے بچے شاید اس بات پر تعجب کریں کہ پہلے اس قسم کے انسان پیدا ہوتے تھے جن کی آنکھوں پر چشمہ نہیں ہوتا تھا۔ صرف آنکھیں ہوا کرتی تھیں۔

ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے اپنی آنکھوں کے علاوہ دوسروں کی آنکھوں پر اس کثرت سے چشمے نظر آنے لگے ہیں کہ واقعی حیرت ہوتی ہو۔ پہلے تو یہ ہوتا تھا

کہ کسی کی آنکھ پر یہ چشمہ دیکھ کر لوگ اس سے عیادت کیا کرتے تھے۔ آنکھوں کا حال پوچھتے تھے ایک آدھ آزمودہ سُرمے کا نسخہ بتا دیتے تھے اور پھر گھبرا کر سب سے کہتے تھے کہ خدا رحم کرے قسمت کا لکھا پورا ہو رہا ہے۔ بیچارے کے چشمہ تک لگ گیا ہے۔ مگر اب تو صرف دو ہی قسم کے چشمہ نہیں لگاتے ایک تو اندھے دوسرے وہ بے فکرے جن کو اپنے تن بدن کا ہوش نہیں ہوتا۔ ورنہ وہ چشمہ جو ضعیفی کی علامت سمجھی جاتی تھی آج کل چھٹانک بھر کے لڑکے لگائے پھرتے ہیں یعنی ہوش بعد میں سنبھالتے ہیں اور چشمہ پہلے ہی لگا لیتے ہیں۔ مرد تو مرد بیچاری عورتیں بھی اس مصیبت میں مبتلا ہیں۔ پہلے استانیاں اور مغلانیاں دو قسم کی خواتین چشمہ آلود نظر آتی تھیں۔ مگر اب تو حال ہے کہ ع

مردانے سے زیادہ زنانے میں دھوم ہے

بچے کھچے بڑے بوڑھے تعجب سے ان چشموں کو دیکھتے ہیں اور اپنی آنکھوں کا حال نہایت فخر سے بیان کرتے ہیں کہ ہم روپیہ کا پانچ سیر گھی کھاتے تھے، جو براہ راست نور بن کر آنکھوں میں پہنچ جایا کرتا تھا۔ گویا آنکھیں گھی سے روشن ہونے والے چراغ ہیں۔ اور چونکہ آج کل خالص گھی مشکل سے ملتا ہے۔ لہذا خالص بینائی بھی نہیں ملتی۔ اور عام طور پر بناسپتی آنکھیں لگائے پھرتے ہیں۔ اس گھی والی وجہ کے علاوہ چشمے کے رواج کے متعلق ہر بڑی بوڑھی اور ہر بڑے میاں کی رائے الگ بھی ہوتی ہے۔ مثلاً کوئی کہتا

کہ یہ سب بجلی کی روشنی کے اندھے ہیں۔ کسی کا خیال ہے کہ انگریزی کتابیں آنکھیں پھوڑ دیتی ہیں۔ کسی کا فیصلہ ہے کہ سینما نے سب کو اندھا کر رکھا ہو۔ ایک جُل گگڑی بڑی بی یہ کہا کرتی ہیں کہ یہ فیشن ہو۔ مگر ایک بزرگ جو چشمہ والوں پر اعتراضات کے سلسلہ میں کچھ ریسرچ بھی کر چکے ہیں مختلف حیثیتوں سے چشمہ کے اس عام رواج پر روشنی ڈالا کرتے ہیں۔ مثلاً ان کا خیال یہ ہو کہ لوگوں نے آنکھوں کی ورزش چھوڑ دی ہو جس کی وجہ سے بینائی کمزور ہوتی چلی جارہی ہو۔ ان سے پوچھا کہ جناب والا یہ آنکھوں کی ورزش کیا چیز ہو تو فرمایا کہ ہمارے زمانے میں بینائی کو قوت پہنچانے کے لئے مختلف قسم کی ورزشیں کی جاتی تھیں۔ مثلاً پتنگ بازی۔

پتنگ بازی میں صرف اُڑانے والا ہی اپنی نظر کی ورزشیں نہیں کرتا۔ بلکہ تمام وہ لوگ جو پیچ دیکھتے ہیں اور کنکوؤں کے کاٹ پیچ پر نظر رکھتے ہیں۔ یہ ورزش کرلیا کرتے ہیں۔ اس ورزش کا دوسرا طریقہ تھا کبوتر بازی، کبوتروں کو اڑا کر انتہائی بلندی پر گھنٹوں ان کا تعاقب کرنے والی نظر کبھی کمزور نہ ہو سکتی تھی۔ ان کا بیان ہو کہ خود انھوں نے چشمہ تو درکنار کتاب پڑھنے کے لئے چراغ تک کی ضرورت چاندنی راتوں میں کبھی محسوس نہ کی۔ البتہ سرمے سے اپنی نظر ضرور مانجا کرتے تھے۔ مگر اب جہاں بڑھاپے کی دوسری کمزوریاں ہیں ان ہی میں نظر کی کمزوری بھی ہو۔ رعشہ کے لئے کہاں سے

چشمہ لائیں۔ دمہ کے لیئے کون سی عینک استعمال کریں۔ ان کا قول تو یہ ہے کہ جب کسی اور کمزوری کے لیے چشمہ نہیں ہے تو محض آنکھوں کی شہ زوری لے کر کیا کریں گے۔

چشموں کے اس طوفان کی اور وجہیں تو خیر ہیں ہی، مگر ایک وجہ ہماری سمجھ میں اور بھی آتی ہے کہ ہمارے بزرگوں کے زمانے میں عینک کو لباس یا زیور کا درجہ حاصل نہ تھا۔ اور اب تو اس صنعت میں ایسے تکلف برتے جاتے ہیں اور ایسے ایسے نظر فریب چشمے بننے لگے ہیں کہ خواہ مخواہ آنکھیں پھوڑ کر عینک لگا لینے کو دل چاہتا ہے۔ کوئی ناک پکڑنے والی عینک ہے۔ تو کوئی کان پکڑنے والی عینک ہے۔ کسی کا شیشہ گول ہے، کسی کا بیضاوی، کسی کا نیم گول اور نیم بیضاوی، کسی کی سونے کی کمانی ہے کسی میں محض شیشے کی تراش کا کمال ہے۔ کوئی ایک آنکھ کی ہے اور کوئی دونوں آنکھوں کی، پھر یہ کہ ان چشموں کو لگا کر چہرے میں عجیب عجیب تبدیلیاں ہوتی ہیں۔ کوئی چشمہ لگا کر حسن بڑھاتا ہے۔ کسی عینک سے چہرہ پر رعب برسنے لگتا ہے کسی چشمے میں یہ صفت ہے کہ چھوٹی آنکھ دیکھنے والے کو بڑی نظر آتی ہے۔ اور کسی چشمے کے بدولت ترچھی نظر بیا ایک آدھ زاویہ سے سیدھی نظر آنے لگتی ہے۔ اس کے علاوہ ایک عام خصوصیت ہر چشمہ کی یہ ہے کہ چشمہ لگانے والا خواہ مخواہ مہذب، تعلیم یافتہ

معزز اور کچھ بڑا آدمی نظر آنے لگتا ہے۔ ان تمام خصوصیات کا نتیجہ یہ ہے کہ نمبری چشموں کے علاوہ صفر نمبر کے تالوں کی بھی بازار میں کافی مانگ بڑھ گئی ہے۔ بات یہ ہے کہ کس کا دل نہیں چاہتا کہ وہ عالم و فاضل مہذب اور معزز، تعلیم یافتہ اور بڑا آدمی نظر آئے مختصر یہ کہ پہلے چشمہ دوا کے طور پر استعمال ہوا کرتا تھا اور اب اس کو لباس یا زیور کی حیثیت حاصل ہے گویا عورتوں کو ایک اور مفت کا زیور ہاتھ آیا۔ اور مرد جو زیور پہن ہی نہیں سکتے تھے اپنی محرومی کی تلافی چشمے سے کر سکتے ہیں اور کسی قسم کا چشمہ نہ سہی دھوپ ہی کا چشمہ سہی۔

ہاں صاحب خوب یاد آیا۔ یہ دھوپ کا بھی عجیب حاجت روا چیز ہے۔ اس کا رواج ہمارے ہی زمانہ کی بات ہے اور اب تو اس کثرت سے دھوپ کے چشمے نظر آنے لگے ہیں کہ شاید آنکھوں سے زیادہ ہی ان کی تعداد ہو گی۔ اس چشمے کو دھوپ کا چشمہ کہا جاتا ہے۔ مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر یہ اب سے پہلے کیوں نہ تھا۔ اس لیے کہ تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ دھوپ ہمیشہ نکلا کرتی تھی اور دھوپ کی عمر آفتاب کی عمر کے لگ بھگ بتائی جاتی ہے مگر دھوپ کے چشمے اب سے پہلے کبھی استعمال نہ ہوئے۔ بہت کچھ سوچنے کے بعد آخر اسی نتیجہ پر پہنچنا پڑتا ہے کہ دھوپ بھی چشمہ لگانے کا در اصل ایک بہانہ ہے۔ دھوپ نہ ہوتی تو چشمہ لگانے کا در اصل ایک بہانہ

ہو۔ دُھوپ نہ ہوتی تو چشمہ لگانے والے سایہ کا چشمہ ایجاد کر لیتے۔ مگر ایک بات ہو کہ چشمے کی یہ قسم ہو بہت مفید، اس سے بہت سے مقصد پورے ہوتے ہیں۔ مثلاً ایک تو یہ کہ یہ چشمہ ہو۔ دوسرے یہ چھتری کا کام بھی دیتا ہو۔ پھر یہ کہ یہ ایسا چشم پوش ہو کہ آنکھ کا کوئی عیب کسی پر ظاہر نہیں ہوتا۔ آنکھ کسی وضع کی ہو۔ بلکہ اگر نہ بھی ہو تو بھی اس چشمہ کی بدولت کسی کو پتہ نہیں چل سکتا کہ واقعہ در اصل ہو گیا، لاکھوں فائدوں میں سے ایک فائدہ یہ بھی ہو کہ بہت سے نظر باز محض آنکھوں کو دیکھ کر دل کا راز بھانپ لیا کرتے ہیں۔ لیکن جن کو اپنے راز عزیز ہیں وہ یہ چشمہ لگا کر اپنی آنکھوں کی غمّازی کا موقع ہی نہیں دیتے کہ کوئی دوسرا دل کی بات ٹٹول سکے۔ مختصر یہ کہ یہ چشمہ صرف چشمے اور چھتری ہی کا کام نہیں دیتا بلکہ آنکھوں کے لئے خس کی ٹٹی، شمامہ اور مسوری بھی ثابت ہوتا ہو پھر یہ کہ اس چشمہ سے عام چشموں کے مقابلہ میں رعب بھی کچھ زیادہ رہتا ہو۔ اور اپنے ہم چشموں میں اگر انسان کو کبھی خفت بھی اُٹھانا پڑتی ہو تو چشمہ بھرم قائم رکھتا ہو اور رنگِ انفعال کا پتہ نہیں چلتا۔

اس میں شک نہیں کہ چشمہ محض دل کی ایک امنگ ہی نہیں بلکہ آنکھوں کی طلب بھی ہو اسی زمانہ میں جبکہ صفر بمبر کے جگمگاتے اور چھپاتے

حسن افروز چشمے استعمال ہو رہے ہیں۔ موٹے موٹے نالوں کے نہایت ہیبت ناک چشمے بھی نظر آتے ہیں کہ اگر ان کو نہ لگایا جائے تو کسی کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر چلا جائے یا لاٹھی کے سہارے راستہ طے کیا جائے مگر ایک خیال یہ بھی ہے کہ چشمے کا رواج جس قدر بڑھ رہا ہے اسی قدر بینائی اپنشن لیتی چلی جا رہی ہے۔ پہلے بینائی کے کمزوری کے مریض اس کثرت سے نہ تھے۔ یعنی یہ مرض موجود تو ضرور تھا مگر وبا کی شکل اختیار نہ کی تھی لیکن چشمے کا اثر رفتہ رفتہ نظروں سے ہوتا ہوا نسلوں تک جا پہنچا ہے اور اب تو پیدائشی طور پر بچے کچھ نابینا سے پیدا ہونے لگے ہیں۔ آخر ان پر کیوں نہ اثر ہو، دادا جان کا انتقال عینک لگائے ہوتا ہے۔ والد محترم ماں کا دودھ چھوڑنے کے بعد عینک لگائے ہوئے ہیں اور یہ سلسلہ خاندان بھر میں پھیلا ہوا ہے۔ بچپن میں تو پتہ نہیں چلتا کہ بچہ نظر نزدیک کی خراب ہے یا دور کی یا دونوں کی۔ لڑکپن میں درد سر کی شکایت شروع ہو جاتی ہے یا سب کے چشمے دیکھ دیکھ اس کی نظر پتھرانے لگتی ہے اور وہ یہ سوچتا ہے کہ آخر وہ اس حق سے کیوں محروم ہے۔ پھر وہ ایک خوبصورت سی بازار میں دیکھتا یا دھوپ کا چشمہ خرید لیتا ہے۔ یہاں تک کہ سر کا درد یا جماعت کا بلیک بورڈ یا دھوپ کا چشمہ اس کے بھی چشمہ لگوا ہی دیتا ہے۔

ماہرین امراض چشم کا تو خیر یہ خیال نہیں ہے لیکن معترضین ذوق چشمہ کی رائے یہ ضرور ہے کہ اسی طرح رفتہ رفتہ بینائی اور پھر چند صدیوں میں آنکھ غائب ہو جائے گی اور انسان کی آنکھ کی جگہ پر چشمہ ہوا کرے گا جو قدرتی طور پر عمر کے ساتھ ساتھ بڑھتا رہے گا گویا عینک لباس اور زیور کی حد سے ترقی کر کے عضو بن جائے گی مگر انسان کی ترقیوں سے بھی خدا بچائے وہ اُس وقت عینک پر لگانے والی آنکھیں ایجاد کرے گا۔ معاف کیجیے گا یہ تو ہم وہ باتیں بیان کرنے لگے جن کو آنکھ فی الحال نہیں دیکھ رہی ہے مگر سوال یہ ہے کہ آنکھ جو کچھ دیکھ رہی اس کو چشم خود دیکھیں یا چشمہ خود۔ دوسرا قانونی نکتہ یہ ہے کہ آنکھ جو کچھ دیکھ رہی ہے وہ تو ہے چشمہ۔ اب چشمہ کیا کچھ دیکھ رہا ہے یہ ہمارا موضوع بحث نہیں۔ لہٰذا با بخیر شما بسلامت۔ چشم ما کور، چشم ما روشن۔

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے وہ دوسروں کو دکھانے کی کوشش کرنا بالکل ایسا ہی ہے جیسے کوئی یہ چاہے کہ اس کا چشمہ دوسرے کی آنکھ پر بھی لگ جائے حالانکہ قدرتی طور پر یہ ناممکن ہے۔ نظر اپنی اپنی چشمہ اپنا اپنا پھر سوال یہ ہے کہ منظر بھی اپنا اپنا کیوں نہ ہو۔ اور کیا یہ مصیبت ہے کہ آپ جو کچھ اپنی آنکھ سے دیکھیں وہی دوسروں کو بھی دکھانا چاہیں۔ صرف چاہیں نہیں

بلکہ اس عجیب بات پر اس حد تک مصر ہوں کہ کوئی اگر آپ کے نقطۂ نظر سے متفق نہ ہو تو آپ اس سے لڑ جائیں۔ دشمنی مول لے لیں اور اس کے خون کے پیاسے ہو جائیں۔ اگر غور کیجئے اور ہماری آنکھوں سے نہیں بلکہ آنکھ سے دیکھنے کی کوشش کیجئے تو دنیا کے تمام ہنگامے خواہ وہ مذہبی ہوں یا سیاسی، سماجی ہوں یا ازدواجی، گھریلو ہوں۔ یا بازاری سب اسی زبردستی کے ماتحت ظہور میں آئے ہیں کہ دوسرے کی آنکھ پھوڑ کر اپنی آنکھ سے اس کو کچھ نہ کچھ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے اور یہ کبھی نہیں سمجھا گیا کہ جس طرح ہم کچھ دیکھ رہے ہیں دوسرا بھی کچھ دیکھ رہا ہو گا۔ اگر انسان فطرتاً اپنی آنکھ سے دوسروں کو سمجھانے کا شوقین نہ ہوتا اور اپنی عینک ہر آنکھ پر لگاتا نہ پھرتا تو دنیا میں کبھی کوئی ہنگامہ نہ اٹھا سکتا تھا۔ مگر مصیبت تو یہ ہے کہ بغیر ان ہنگاموں کے دنیا بے معنی ہو جاتی ہے لہذا ان ہنگاموں کو ظہور میں لانے کے لیے بہت سے سامان کیے گئے۔ مثلاً آنکھوں کے ساتھ ہی ساتھ ایک ایک دل اور دماغ بھی ہر ایک کو دیا گیا تاکہ صرف دیکھو نہیں بلکہ سمجھو اور محسوس بھی کرو خیر یہاں تک ہی غنیمت تھا مگر ایک قیامت اور بھی ہر ایک کے حصہ میں آئی جس کو زبان کہتے ہیں تاکہ جو کچھ دیکھو۔ جو کچھ محسوس کرو اور سمجھو وہ سب اس زبان سے کہہ بھی دو۔ اگر آنکھ دیکھتی اور نہ کہہ سکتی تو بھی کوئی خطرہ نہ تھا۔ مگر لطف تو یہ ہے کہ آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے وہ

زبان پر بھی آجاتا ہو اور زبان پر اس لیے آتا ہے کہ دوسرے کے کانوں
میں کانوں میں ہوتا ہوا دل اور دماغ سے گذر کر آنکھوں تک پہنچ جائے
اور اگر نہ پہونچے تو بس یہیں سے فوجداری شروع۔

دنیا نے ہر قسم کی ترقی کی۔ جملہ اقسام کی بیداریاں پیدا ہوئیں طرح
طرح کے انقلاب آئے۔ آزادی کا احساس اِس حد تک جاگا کہ عورتوں
کی آزادی مردوں کی آزادی یہاں تک کہ ادب و شاعری تک کی آزادی
انگڑائی لے کر اُٹھ بیٹھی۔ مگر نظروں کی آزادی کا کوسوں پتہ نہیں ہو اور
نہ اس آزادی کا کسی کو ہوش ہو۔ لیڈر اب بھی یہ چاہتا ہو کہ اس کے
پیرو اس کی آنکھ سے دیکھیں۔ باپ اب بھی مصر ہو کہ بیٹا وہی دیکھے جو
جو والد صاحب کو نظر آرہا ہو۔ ساس اور بہو کے تمام اختلافات کی جڑ
یہی ہو کہ دونوں کا نقطۂ نظر ایک نہیں ہوتا۔ میرا خیال تو یہ ہو کہ ساس
اور بہو دونوں میں سے ایک اندھی ہو تو شائد لازمی قسم کی لڑائی ختم ہو جائے۔

عام طور پر دیکھا گیا ہو کہ وہی شادی کامیاب سمجھی جاتی ہو جس میں
دُلہن یا دولھا دونوں میں سے ایک نابینا ہو۔ نابینا سے مراد یہ نہیں
کہ آنکھیں ہی نہ ہوں یا آنکھیں تو ہوں مگر دیکھتی نہ ہوں، جی نہیں مطلب
مطلب یہ ہو کہ ان دونوں میں سے ایک اپنی آنکھوں کے جملہ حقوق سے
دست بردار ہو جائے۔ مثلاً بیوی اپنی آنکھوں کے حق سے دست بردار ہو گئی

اور اس نے میاں کی آنکھوں سے دنیا کو دیکھنے کا کام شروع کیا اس کا طریقہ یہ ہوگا کہ وہ اپنی آنکھوں سے صرف میاں کو دیکھے گی اور میاں کی آنکھیں ساری دنیا کو گویا وہ بھی ساری دنیا کو دیکھ سکے گی مگر معرفت اپنی شوہر کے۔ شوہر کا ہر پسندیدہ منظر بیوی کا بھی پسندیدہ منظر ہوگا۔ شوہر کی ہر نگاہِ تنفر بیوی کی بھی نگاہِ تنفر ہوگی۔ گویا آنکھیں تو بظاہر چار ہوں مگر انہیں سے دو آنکھوں کا اور دو چشم خانوں کا کام دیں گی لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ یہ دو دل بھی ایک رہیں گے، اور بیوی محض آنکھوں کی نعمت سے محروم ہوکر اپنی ازدواجی زندگی کو اپنے لئے نعمت بنالے گی یا اگر صورتِ حال اسکے برعکس ہوئی یعنی شوہر صاحب نے اپنی آنکھوں کو بیوی کی آنکھوں کے ہاتھ بیچ دیا تو ان کا گھر ان کی جنّت ہی بن جائے گا۔ لیکن ایسا بھی دیکھا گیا ہے کہ میاں اور بیوی دونوں کے اتفاق سے آنکھیں ہیں اور دونوں اپنی بینائی کے حق سے دست بردار ہونے کو تیار نہیں ہیں تو یہ سمجھ لیجئے کہ ان دونوں کی کبھی بنتھ نہیں سکتی۔ شوہر اپنی آنکھ سے بیوی کو دکھائے گا کہ میرے تمام عزیز تمھارے تمام عزیزوں سے بہتر ہیں۔ بیوی اپنی آنکھوں سے اس کے تمام عزیزوں کے عیب دیکھ کر اپنی آنکھ سے اپنے تمام عزیزوں کے ہنر اس کو دکھانا چاہے گی۔ وہ کہے گا کہ تم مجھ کو اندھا

بتاتی ہو۔ وہ کہے گی کہ تم مجھ کو اندھا بتاتے ہو۔ یہی تُو تُو میں میں یا تو طلاق کی حد پہونچ جائے گی ورنہ دونوں کی زندگی تلخ بن جائیگی کاش ان دونوں میں سے کوئی اندھا ہوتا سو باتوں کی ایک بات تو یہ ہو کہ آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے وہ دوسرے کو دکھانے کی کوشش کرتی ہو یہ تو انسان کا مقدر بن چکی ہو لہذا شادی کے وقت بجائے یہ تحقیقات کرنے کے کہ لڑکا کیا لکھا پڑھا ہو۔ لڑکی کی صورت شکل کیسی ہو لڑکا کتنے کا نوکر ہو۔ لڑکی کے نام کچھ جائداد ہو یا نہیں۔ لڑکا کس خاندان سے ہے۔ لڑکی سگھڑ ہے یا نہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔ صرف یہ دیکھنا چاہیے کہ لڑکا اندھا ہو یا نہیں اور لڑکی میں کہیں بینائی کا مرض تو نہیں۔ اگر ان دونوں میں سے ایک بھی اندھا ہو تو بس آنکھیں بند کرکے شادی کر دینا چاہیے اور اگر دونوں کے آنکھیں ہوں تو یہ بات گرہ میں باندھ لیجیے کہ سورج کا مغرب سے طلوع ہونا تو ممکن ہو لیکن اس قسم کی شادی کا خوشگوار ہونا قطعاً ناممکن ہو۔

خیر شادی بیاہ کے معاملات میں تو اس قسم کی جانچ پڑتال سے کام چل سکتا ہو مگر اس کے علاوہ دوسرے تعلقات کو ان آنکھوں کی موجودگی میں کیونکر خوشگوار بنایا جا سکتا ہو۔ ایک باپ کو آخر یہ کیوں خواہش پیدا ہوتی ہو کہ چونکہ وہ برج کو اچھی نظر سے دیکھتا لہذا اس کا بیٹا بھی

اس کو اچھی نظر سے نہ دیکھے حالانکہ بیٹا اپنی آنکھ سے برج کو اچھی
سوسائٹی کی تفریح دیکھتا ہے۔ مہذب لوگوں کو برج کھیلتا ہوا اس نے
دیکھا ہے اور وہ جانتا ہے کہ تعلیم یافتہ طبقہ میں اس کھیل کو اچھی طرح
سے دیکھا جاتا ہے۔ اب یا تو وہ اپنی آنکھیں پھوڑ لے یا والد صاحب کو
خوش کرنے کے لئے جھوٹ بولے اور چوری چوری برج کھیلے ورنہ
والد صاحب برابر یہی کہے جائیں گے کہ لڑکا نالائق نکل گیا۔ برج
کھیلتا ہے یعنی قمار باز ہے۔ حالانکہ وہ غریب نالائق ہے نہ قمار باز ہے
بلکہ قصور اس کا صرف یہ ہے کہ اس کو بھی خدا نے اپنے باپ کی آنکھوں
کے علاوہ ذاتی آنکھیں بھی دی ہیں۔ ہونا دراصل یہ چاہیے تھا کہ
باپ کی زندگی میں لڑکے نابینا ہوا کرتے اور باپ کے مرنے کے بعد
تمام مال و متاع کے ساتھ ہی ساتھ آنکھیں بھی لوگوں کو ورثہ میں
ملا کرتیں یا یہ ہوتا کہ لڑکا پیدا ہونے کے بعد باپ اندھا ہو جایا کرتا
مگر ان دونوں میں سے ایک بات بھی نہ ہو سکی لہذا یہ ہو رہا ہے کہ باپ
چاہتا ہے کہ میری نظر سے لڑکا دنیا کو دیکھے اور لڑکا یہ سمجھتا ہے کہ
والد صاحب کی نظریں ہیں پرانی وہ میری نظروں سے دنیا کو دیکھیں
تو زیادہ اچھا ہے۔ اسی اختلاف کا نتیجہ یہ لڑکے کے عاق ہوتے
رہتے ہیں، گھروں سے نکال دیئے جاتے ہیں۔ باپ صورت تک دیکھنے کا

روادار نہیں رہتا۔ ورنہ لڑکے نے بہت سعادت مندی سے کام لیا تو والد بزرگوار کی آنکھوں میں دُھول جھونکنا شروع کر دیا اور چھپ چھپ کر وہ سب کچھ کرنے لگا جو اُس کی آنکھیں اچھا دیکھتی ہیں اور اس کے والد کی آنکھیں بُرا۔

یہ تو خیر معمولی گھریلو باتیں ہیں، مگر آپ موجودہ زمانے یا کسی تاریخی زمانے کے کسی بڑے سے بڑے جھگڑے کو دیکھ لیجیے۔ بنیاد آپ کو یہ ہمیشہ نظر آئے گی کہ اپنی آنکھوں کا منظر دوسرے کی آنکھوں میں ٹھونسنے کی کوشش کی گئی تھی جس کا نیتجہ یہ تاریخی معرکہ ہوا۔ مذہبی لڑائیاں اسی لئے لڑی گئیں، سیاسی سرپھٹّول ہمیشہ اسی کی بدولت ہوئی۔ بلکہ سچ پوچھیے تو ہر قسم کی جنگ کی ابتدا اسی وجہ سے ہوئی کہ آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے وہ دوسرے کو ضرور دکھایا جائے۔ اور یہ بھی کیا جائے کہ دوسرے کی آنکھ جو کچھ دیکھ رہی ہے وہ نہ دیکھے اور اُس کے بجائے وہ بھی وہی دیکھے جو ہماری آنکھ دیکھ رہی ہے۔ اس وقت ہمارا موضوع گفتگو بھی یہی ہے کہ آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے وہ ہم دوسروں کو دکھانے کی کوشش کرکے ایک نیا فتنہ بیدار کریں مگر ہم جانتے ہیں کہ ہماری آنکھ کے علاوہ دوسروں کی آنکھیں ہیں اور ان سب آنکھوں کا کام بھی دیکھنا ہے۔ لہذا ہم اپنی آنکھ کو ساری دنیا کا چشمہ ثابت

کرنے کی کوشش ہی کیوں کریں۔ البتہ اس موضوع کی وجہ سے یہ پورا شعر کچھ مشکوک سا ہو گیا ہے ؎

آنکھیں جو کچھ دیکھتی ہیں لب پر آ سکتا نہیں
محوِ حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائیگی

ہماری رائے میں یہ شعر اصل میں یوں ہے ؎

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پر آ سکتا ہے سب
محوِ حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو ئیگی

اب اس شعر کی شرح اس طرح ہوگی کہ ہماری آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے وہ دوسروں کو دکھانے کے لئے سب کچھ لب پر لے آتی ہے اور ہم زبردستی کوشش کرتے ہیں کہ جو کچھ ہم نے دیکھا ہے وہی سب دیکھیں اس سلسلہ میں ظاہر ہے کہ تو تو میں میں کے بعد ہاتھا پائی اور دھینگا مشتی تک کی نوبت آتی ہوگی۔ لہذا یا تو اس لپاڈگی میں کسی کی بھی آنکھ باقی نہ رہیگی اور دوسروں کی آنکھ پھوڑنے کی یہ عالمگیر کوشش عالمگیر کامیابی حاصل کرلے گی ورنہ سب کے نقطہ ہائے نظر اس حد تک ایک ہو جائیں گے کہ سب کی آنکھیں مل کر ایک بہت بڑی آنکھ بن جائے گی اور یہ گول گول دنیا کا کرہ آخرکار ایک عظیم دیدہ بن کر رہ جائے گا۔ بہرحال شاعر کہتا ہے کہ محوِ حیرت ہوں کہ دنیا بالکل اندھی ہو جائے گی یا سراسر آنکھ بن کر رہے گی۔

گویا یہ طے ہے کہ یہ درمیانی صورت اور یہ دیکھنے دکھانے کی کشمکش تو
یقیناً باقی نہیں رہ سکتی۔

خیر یہ تو شاعری ہے مگر واقعی غور کیجیے کہ ہم جو کچھ دیکھتے ہیں وہ
دوسرے کو دیکھنے پر مجبور کیوں کرتے ہیں بلکہ یہ بھی غور کیجیے کہ اس
ساری پابندی کے بعد کسی قسم کی کوئی آزادی بھی صحیح معنوں میں
آزادی کہی جا سکتی ہے۔ مگر نہیں ہم کو تو دراصل یہ بھی نہ کہنا چاہیے اسلیے
کہ یہ تو ہم نے بھی وہی کوشش شروع کر دی جس کے خلاف احتجاج کر رہے
تھے۔ بہر حال ہم نے یہ دیکھا ہے مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ آپ بھی یہی
ضرور دیکھیں ممکن ہے اسی سلسلہ میں آپ کے پیش نظر کچھ اور ہی
مناظر ہوں اور ہمارے اس کہنے کے بعد آپ وہ مناظر اپنی آنکھوں
سے ہم کو دکھانا چاہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ بات بڑھ جائے گی اور
اچھے دل بڑے ہوں گے یا تو ہم آپ کی آنکھ سے کچھ دیکھنے کو تیار ہو جائیں
ورنہ آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے وہ لب پر ہی نہ لائیں اور ایک چپ سے
ہزار بلائیں ٹالیں۔

ہماری بڑی بوڑھیاں کہانی اس طرح شروع کرتی ہیں کہ آنکھوں
کی دیکھی کہتے نہیں کانوں کی سنی کہتے ہیں کہ ایک تھا بادشاہ ہمارا تمھارا

خدا بادشاہ اس بادشاہ کے تھے سات بیٹے وغیرہ وغیرہ۔ گویا کانوں کی سنی کہہ دینا اتنی ذمہ داری کی بات نہیں ہے جتنی آنکھوں کی دیکھی کہنا ہے۔ اور غالباً یہی وجہ ہے کہ آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے وہ لب پر نہیں آسکتا بلکہ اگر غور کیجیے تو عافیت بھی اسی میں ہے کہ وہ لب پر نہ آئے۔ اس میں شک نہیں کہ کانوں کی سنی لب پر لانا اس قدر آسان نہ ہونا چاہیے جسقدر آنکھوں کی دیکھی کہہ دینا۔

اگر یہ تصویر ہے — تو —

میرے ایک نہایت مشہور و معروف آرٹسٹ دوست ایک دن میری جہالت کے قائل ہو کر مجھ سے سخت مایوس ہوئے۔ وہ بڑے چاؤ کے ساتھ اپنے کمالاتِ فن دکھانے مجھے اپنے اسٹوڈیو میں لے گئے اور بڑے فخر کے ساتھ اپنی ایک تصویر دکھا کر مجھ سے پوچھا کہ یہ کیا ہے؟ میں نے اس تصویر کو نہایت سنجیدگی کے ساتھ غور سے دیکھا اور جب بخوبی اس گورکھ دھندے کو سمجھ لیا تو عرض کیا۔

"یہ آرام کرسی ہے۔"

آرام کرسی کا نام سن کر وہ ایک دم اچھل پڑے اور دیر تک مجھ کو حیرت سے دیکھتے رہے کہ میں کہہ کیا رہا ہوں اس کے بعد بغیر کوئی اور تصویر دکھائے مجھے اسٹوڈیو سے باہر لے آئے اور جب میں نے ان کی اس مایوسی کو سمجھنے کی کوشش کی، تو وہ برس پڑے مجھ پر کہ:۔

عجیب واہیات قسم کے جہلِ مرکب ہیں آپ بھی کہنے لگے آرام کرسی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ

یعنی تجریدی فن کی ابجد سے بھی آپ واقف نہیں ہیں۔ میں نے
خواہ مخواہ بھینس کے آگے بین بجائی۔"

میں نے تجریدی آرٹ سے اپنی نافہمی کا اعتراف کرتے ہوئے پوچھا۔
"جس کو میں نے آرام کرسی کہا ہے وہ آخر ہے کیا۔" وہ غصہ کرنے کے
بجائے میری حماقت پر کُڑھ کر بولے۔
"بھائی وہ مایوس عورت ہے۔"

مجھے اپنے اس جہل کا اعتراف ہے کہ میں تجریدی آرٹ کی ان بھول بھلیوں کو
سمجھنے سے قاصر ہوں اور آج بھی "مایوس عورت" کو میں سوائے "آرام کرسی" کے اور
کچھ نہیں سمجھ سکتا۔ قصور میرا صرف یہ ہے کہ میں سچائی کے ساتھ اعتراف کر رہا ہوں
اپنی جہالت کا ورنہ ایک سے ایک اجہل کو میں نے خود معمہ تصاویر کی نمائش میں دیکھا
ہے منہ میں پائپ دبائے چہرے کو تجریدی آرٹ بنائے اقلیدس کی کوئی بیہودہ سی
شکل دینے کھڑے ہیں یہ حضرت اور داد دے رہے ہیں اس عجیب الخلقت تخلیق کی کہ
مصور خود دوڑا ہوا آیا اور اس نے کہا کہ "معاف کیجئے گا یہ تصویر الٹی ٹانگ دی گئی
تھی۔" اور یہ سُنکر یہ حضرت خود ہی اُلٹے ٹنگے ہوئے نظر آنے لگے۔ اس قسم کی ایک
نمائش میں ایک چوکھٹے میں سادہ کینوس دیوار پر آویزاں تھی اور عنوان تھا تصویر کا
"چڑیا اور دانا" لوگ اس کو دیکھتے تھے اور دیکھتے ہی رہ جاتے تھے کہ اس میں چڑیا

کہاں ہے اور دانہ کس طرف ہے۔ آخر ایک صاحب نے مصور سے پوچھا کہ "دانہ کہاں ہے" وہ بولا "چڑیا کھا گئی" اس نے پوچھا "اور وہ چڑیا کہاں ہے۔" اس نے کہا "اڑ گئی۔" تو جناب عرض مدعا یہ کہ اپنے بس کا روگ تو ہے نہیں اس تجریدی آرٹ کو سمجھنا اب خواہ کوئی ہم کو احمق سمجھے یا افسوسناک قسم کا جاہل مطلق۔

اس موضوع کی طرف متوجہ یوں ہونا پڑا کہ آرٹ کونسل آف پاکستان کے صدر این۔ ایم۔ خاں صاحب نے اس بات پر افسوس کا اظہار کیا ہے کہ ہمارے چابک دست صناعوں اور ماہر فن مصوروں کے آرٹ کی قدر دانی کرنے کے بجائے فلمی ستاروں کی تصاویر سے دلچسپی لینے والوں کی تعداد ہمارے یہاں بہت زیادہ ہے۔ اگر سچ پوچھئے تو یہ بات غلط نہیں ہے مگر اس کی وجہ صرف یہی ہے کہ فلمی ستاروں کی تصاویر دیکھنے کے لئے نہ آنکھوں پر زور دینا پڑتا ہے نہ دماغ پر ایک نظر دیکھتے ہی سمجھ میں آجاتا ہے یہ مدھوبالا ہیں یہ نورجہاں ہیں یہ شیاما ہیں اور یہ نیلو ہیں اگر ان فلمی ستاروں کی تصاویر بھی تجریدی آرٹ والے بنانا شروع کر دیں تو یقین جانئے کہ ان فلمی ستاروں کی صورت سے بھی نفرت ہو کر رہ جائے کہ ایک تصویر سامنے لاکر پوچھا جائے کہ یہ کیا ہے۔!

ہم جواب دیں کہ "شہتیر ہے۔"

مصور صاحب ہنس کر کہیں کہ "غور سے دیکھئے یہ مسرت نذیر ہے۔"

پھر دوسری دکھا کر پوچھا جائے یہ کیا ہے۔

ہم پوچھیں کہ "یہ توپ ہے۔"

مصور صاحب پھر سمجھائیں "توپ نہیں اس کے خطوط اور دائرے غور سے دیکھئے یہ گوپ ہے۔"

رہ گئی فلمی ستاروں کی تصاویر کی مقبولیت وہ تو واقعی وبائی حیثیت رکھتی ہے اور ایک تصاویر پر کیا منحصر ہے عالم تو یہ ہے کہ اب اگر حوالے کے طور پر اشعار بھی استعمال ہوتے ہیں تو میر اور غالب، حافظ اور سعدی وغیرہ کے نہیں بلکہ فلمی گانوں کے بول استعمال ہوتے ہیں مثلاً ہمارے بزرگ اپنے احباب کو خط اس طرح لکھتے تھے۔

"اب تو دیکھنے کو بھی آنکھیں ترس گئیں ہیں کاش کبھی تم اس طرف کا رخ کرتے۔"

مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کئے ہوئے

جوش قدح سے بزم چراغاں کئے ہوئے

اور اب ہمارے نوجوان اپنے احباب کو یہی بات یوں لکھتے ہیں کہ

اب تو دیکھنے کو بھی آنکھیں ترس گئیں کاش کبھی تم اس طرف کا رخ کرتے۔

تو ن سی بدلی میں مرے چاند ہے آجا

تارے ہیں مرے زخم جگر ان میں سما جا

مقرر اپنی تقاریر میں فلمی گانوں کے بول استعمال کرتے ہیں کہ :۔

"حضرات! ہم کو صرف جھوٹے وعدوں پر ٹرخایا جاتا ہے
اور ہمارے ساتھ طفل تسلیوں سے کام لیا جاتا ہے۔ ہمارے افسران
بالا تو ہمارے ساتھ ہمیشہ اس طرح پیش آتے ہیں کہ :۔

لارے لپّا لارے لپّا لائی رکھدا

روز مرہ کی گفتگو ہو یا خط و کتابت مضمون نگاری ہو یا خطابت آپ کو کیا
معلوم کہ کس کس جگہ یہ فلمی گانے استعمال ہوتے ہیں۔

فلمی گانوں پر کیا منحصر ہے حال تو یہ ہے کہ بال کٹوانے بیٹھے ہیں اور ہیر ڈریسر
سے کہہ رہے ہیں کہ بس ویسے ہی بال بنا دو جیسے دلیپ کمار کے ہیں۔ کپڑا
لے کر صاحبزادیاں درزی کے یہاں گئی ہیں اور اس سے فرمائش کر رہی ہیں
کہ اسی ڈزائن کی قمیص بنادو جیسی شکیلہ فلم ٹیکسی ڈرائیور میں پہنے ہوئے ہے اور
بلاؤز اسی فیشن کا ہو جیسا نرگس کا تھا فلم بابل میں۔ عالم تو یہ ہے کہ پہلے
نوجوان اسیات کی کوشش کرتے تھے کہ ابّا جان یا چچا جان یا ماموں جان کا انداز
گفتگو اختیار کریں۔ مگر اب انکی کوشش یہ ہوتی ہے کہ راجکپور کی طرح بات کریں سنتوش کمار
کی چال چلیں۔ دلیپ کمار کیطرح ہنسیں۔ پریم ناتھ کی طرح جست لگائیں تاکہ دیکھنے والے انکو
بھی ہیرو سمجھیں اور انکو دیکھنے والیاں گنگنانا شروع کردیں کہ :۔

ہاتھ میں ہاتھ ہو چاندنی رات ہو کیسی یہ بات ہو

تقریر ایک مکھی کی

لاہور کارپوریشن کے پچھلے سال کے اس کارنامے کی اخبارات میں دھوم مچی ہے کہ اس نے ۱۹۵۸ء میں کتّے بلیاں چوہے اور مکھیاں مارنے پر تقریباً ساڑھے تین لاکھ روپیہ صرف کیا ہے۔ اخبارات میں یہ خبر پڑھ کر لاہور کارپوریشن کی حدود میں رہنے والے کتّے بے ساختہ بھونک پڑے اور علم الحیوانات کے ماہروں نے فوراً پہچان لیا کہ یہ دراصل بھونک نہیں رہے ہیں بلکہ قہقہے بلند کر رہے ہیں۔ یہ خبر جب لاہور کی بلیوں نے سُنی تو وہ میاؤں میاؤں کرتی ہوئی مارے ہنسی کے لوٹ گئیں۔ چوہوں کی نظر سے جب یہ خبر گذری تو وہ اپنے بلوں سے نکل نکل کر مونچھوں پہ تاؤ دے دے کر ہنسے اور مکھیوں نے تو ہنس ہنس کر وہ بھنکار پیدا کی اور یہ خبر پڑھنے کے لئے اخبارات کے صفحوں پر اس کثرت سے آکر بیٹھیں کہ سوائے ان کے اور کوئی اخبار پڑھ ہی نہ سکتا تھا معلوم ہوا ہے

کو کتوں۔ بلیوں۔ مکھیوں اور چوہوں کو اس شدت سے ہنسی اس بات پر آئی کہ
اتنا روپیہ ہم کو مارنے پر صرف کیا گیا مگر ہم بدستور موجود ہیں اور ہمارا آج
بھی یہی ترانہ ہے کہ ؎

پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا۔

اعداد و شمار یہ پیش کئے گئے ہیں کہ پچھلے سال چودہ ہزار نو سو باون (۱۴۹۵۲) تو صرف
کتے پکڑے گئے ہیں جن کو زہر دے دے کر ہلاک کیا گیا۔ بلیوں کی تعداد ظاہر
نہیں کی گئی اور نہ یہ بتایا گیا کہ ان بلیوں نے خودکشی کی یا ان کو پھانسی دی گئی۔
چوہوں کے متعلق کہہ دیا گیا ہے کہ وہ علی الحساب پکڑے اور مارے گئے۔
مکھیوں کا شمار اس لئے نہ ہو سکا کہ کارپوریشن کے پاس کافی عملہ نہ تھا جو
مگس شماری کرتا اور صحیح صحیح اعداد پیش کر دیتا۔ بہر صورت یہ مہم اس سال
بھی جاری رہے گی اور اگلی بجٹ میں اس مہم کے لئے پچھلے بجٹ سے ایک لاکھ
روپیہ زیادہ رکھا گیا ہے ممکن ہے اس کی وجہ یہ ہو کہ پچھلے سال کی اس
کامیاب مہم کے بعد آوارہ کتوں جنگلی بلیوں۔ گھریلو چوہوں اور ہرجائی مکھیوں
کی تعداد اور بھی بڑھ گئی ہو۔ ظاہر ہے کہ اگر یہ تعداد بڑھی نہ ہوتی تو اس بجٹ
میں یہ اضافہ کیوں ہوتا اور اگر تعداد بڑھ گئی ہے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ
جب اس تعداد کو گھٹانے کی کوشش کی جاتی ہے یہ بڑھ جایا کرتی ہے ان حالات

میں کوشش یہ کرنا چاہیئے کہ کارپوریشن والے اس مہم کو ختم کردیں ورنہ آئندہ سال یہ تعداد اتنی اور بڑھ جائے گی کہ پھر بجٹ میں ایک لاکھ کا اضافہ کیا جائے اور رفتہ رفتہ کارپوریشن کا پورا بجٹ کتوں۔ بلیوں۔ چوہوں اور مکھیوں کے نذر ہو جایا کرے گا۔

بات دراصل یہ ہے کہ ایک طرف تو ان جانوروں کو مارنے کی مہم چلائی جاتی ہے۔ دوسری طرف ان ہی جانوروں کی افزائش نسل کی مہم بھی چلتی رہتی ہے کہ شہر میں ہر طرف گندگی کا بھی اہتمام رکھا جاتا ہے کوڑے کرکٹ کے ڈھیر بھی رہتے ہیں نالیوں کو بھی اسی لئے صاف کرنے سے محفوظ رکھا جاتا ہے کہ آخر یہ بھی تو جاندار ہیں ان کو بھی تو زندگی کا حق ہے چنانچہ ابھی پچھلے دنوں مکھیوں کے ایک جلسۂ عام میں ایک پُرجوش مقرر مکھی نے نہایت دھواں دھار تقریر کی کہ :۔

معزز مکھیو! آج ہم سب اس لئے یہاں یکجا ہوئے ہیں کہ انسان کی ان چیرہ دستیوں کے خلاف پُرزور احتجاج کریں کہ اس نے ہماری نسل کو ختم کردینے کا بیڑہ اٹھا رکھا ہے۔ اس نے ہم کو مارنے کے لئے محکمے قائم کر رکھے ہیں۔ ہم کو مارنے کے لئے روپیہ پانی کی طرح بہا کر طرح طرح کی زہریلی دوائیں بنائی ہیں۔ وہ اشرف

المخلوقات ضرور ہے مگر اے مکھیو! اب یہ تمہارا فرض ہے کہ اس انسان کو یہ بتادو کہ خدا کی اس دنیا پر صرف اسی کا حق نہیں ہے ہم بھی آخر اسی خدا کی مخلوق ہیں اور اس دنیا میں زندہ رہنے کا ہم کو بھی حق ہے۔ آخر ہم اپنے فرائض سے کیوں غافل ہیں اگر یہ انسان ہمارے لئے فلٹ اور ڈی۔ ڈی۔ ٹی وغیرہ استعمال کر رہا ہے تو ہم اس کے خلاف ہیضہ ٹائیفائڈ اور دوسرے امراض پھیلانے کی مہم میں غفلت سے کیوں کام لے رہے ہیں۔ میں مبارکباد دیتی ہوں ان فرض شناس مکھیوں کو جن کی فرض شناسی نے سوزش امعار ایسی بیماری پھیلائی۔

اس تقریر پر مکھیوں نے داد اور تحسین کی بھنبھناہٹ پیدا کی اور خوب خوب تالیاں بجائیں۔

اس پرجوش تقریر کے بعد ایک بزرگ مکھی اٹھی اور بھنبھناہٹ کے مٹوں میں اسٹیج پر آکر نہایت وقار سے اس نے اپنی تقریر شروع کی کہ:۔

عزیز مکھیو! مجھ سے پہلے آپ نے ایک پرجوش خطیبہ کی تقریر سنی ہے۔ میں بھی اس تقریر ——— اور اس جوش پر اپنی عزیز بہن کو مبارکباد دیتی ہوں مگر ساتھ ہی ساتھ مجھ کو یہ عرض کرنے کی اجازت

دیکھئے کہ آپ نے صرف چند روزہ حالات سے متاثر ہو کر تاریخ کو بالکل بھلا دیا ہے اور نوجوانی کے جوش میں آکر ایسی تقریر کی ہے ورنہ اگر آپ تاریخ پر نظر ڈالیں تو آپ کو اسی اشرف المخلوقات کے احسانات بھی نظر آجائیں گے جس سے آج آپ نالاں ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ مارشل لا کے نفاذ کے بعد سے ہمارا قلع قمع کرنے کی جد و جہد میں سرگرمیاں دکھائی گئی ہیں ورنہ اس سے پہلے میں پوچھتی ہوں کہ یہ غلاظتوں کے انبار ہمارے لئے کس نے لگائے تھے۔ یہ جا بجا کوڑے کے ڈھیر ہمارے لئے کس نے سجائے تھے۔ یہ نالیوں اور نالیوں کا پانی ہمارے لئے کس نے سڑایا تھا گندگی کو محفوظ رکھنے کے لئے صفائی سے گریز کس نے کیا اسی انسان نے میری پیاری بہنوں اسی انسان نے۔ وہ ہمارے لئے جا بجا گنے کھا کھا کران کے چھلکوں کے ڈھیر لگاتا پھرتا تھا۔ وہ خود اپنے کھانے پینے کی چیزوں کو ہمارے لئے کھلا رکھتا تھا وہ اپنے گھروں کی صفائی بھی اس لئے نہ کرتا تھا کہ ہم کو تکلیف ہوگی۔ ہم اس کے باورچی خانوں میں اپنی چھاؤنی بناتے تھے۔ ہم اس کے دسترخوان پر بلغار بولتے تھے ہم اس کے کھانے کی میز پر چھاپہ مارتے تھے ہم اس کی چائے کی پیالیوں میں پیراکی کی مشق کرتے تھے۔ اس کے سالن کے پیالوں میں خودکشی

کا شوق پورا کرتے تھے۔ اس کے پینے کے دودھ میں دودھوں نہاتے تھے۔ کیا اتنی جلدی آپ یہ سب کچھ بھول گئیں۔ میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ آپ ہیضہ نہ پھیلائیں۔ ٹائیفائڈ اور چیچک۔ سوزش امعاء اور دوسرے وبائی امراض کو نہ پھیلائیں یہ سب تو آپ کے فرائض میں داخل ہے مگر ان دونوں تکس کشی پر جو زور دیا جا رہا ہے اس کے معنی یہ نہیں کہ آپ انسان کے پچھلے احسانات کو بھول جائیں ہم احسان فراموش نہیں ہیں۔ ہم شکوہ اور شکر کا توازن برقرار رکھتے ہیں۔"

شکر کو بعض مکھیاں شکر سمجھیں اور بیتاب ہو ہو کر اڑیں لہٰذا جلسہ درہم برہم ہو گیا ورنہ اس جلسہ کی قرار دادیں اللہ جانے کیا ہوتیں۔

لاہور کارپوریشن کے حدود میں رہنے والے کتنے بلیاں چوہے اور مکھیاں دراصل اس بات پر تو ہنس ہی رہی ہیں کہ ہم کو مٹانے کی جتنی کوششیں ہو رہی ہیں اتنے ہی ہم لہلہا رہے ہیں مگر ان کو اس بات پر بھی رہ رہ کر ہنسی آتی رہی کہ جتنا روپیہ ہم کو مارنے پر صرف ہو رہا ہے اگر اتنا ہی روپیہ انسان خود اپنے ہم جنسوں کو فاقہ مرگی سے نجات دلانے کے لئے دیدیتا یا ان کے پھٹے حال کی اصلاح پر صرف کرتا تو ایک بات بھی تھی۔ رہ گیا ہم کو مارنا تو ہم یقین دلاتے ہیں کہ ہم ان تدابیر

سے اس وقت تک نہ مرسکیں گے جب تک خود انسان کو برسوں فلٹ اور ڈی ڈی ٹی پلا کر اندرونی طور پر نفاست پسند نہ بنا دیا جائے یا انسان غیرارادی طور پر نگس پرور واقع ہوا ہے اور نمائشی طور پر اس سے مکھیاں مارنے کا کام لیا جاتا ہے لہذا ہم مرنے کو تو مر جاتے ہیں مگر اس سے زیادہ پیدا بھی ہو جاتے ہیں۔ اور ہماری نمائندگی کم ہونے کے بجائے روز بروز بڑھ رہی ہے سچ تو یہ ہے کہ جسے اللہ رکھے اُسے کون چکھے اور یہ بھی واقعہ ہے کہ۔ ع

مری تخریب میں مضمر ہے اک تعمیر کی صورت

خدا کی شان دیکھو

تعمیری دور کا مطلب ہم یہ سمجھ رہے تھے کہ جدھر دیکھئے دھڑا دھڑ مکانات بن رہے تھے ایک سے ایک نئے ڈزائن کی کوٹھیاں تعمیر ہو رہی تھیں تعمیرات کا ایسا جال پھیلا ہوا تھا کہ دیکھتے ہی دیکھتے کراچی کے نہ جانے کتنے سپاٹ میدان دیکھو دیکھو ایوانوں اور محلوں سے پٹے ہوئے نظر آنے لگے۔ ہر ایرے غیرے کو تو عماراتی سامان تک میسر نہ آتا تھا سیمنٹ لوہا اور لکڑی صرف ان لوگوں کو حاصل ہو سکتی تھی جو یا تو ان چیزوں کے وزن کے برابر روپیہ تول دیں یا اپنے اختیارات سے کام لے کر ڈنڈے کے زور پر یہ چیزیں حاصل کر سکیں ورنہ جو لوگ نہ کوئی مالی حیثیت رکھتے تھے نہ اثر اور اقتدار ان کو حاصل تھا وہ تو گھر بنانے کے لئے نیو کھود کر اس نتیجہ پر پہنچے تھے کہ غالباً اپنی قبر کھدوالی ہے جس میں اپنی بے زری اور بے دست و پائی کے ساتھ دفن ہونے کا ارادہ ہے۔ اور جب ان سے کوئی پوچھتا تھا کہ کیوں جناب کس منزل پر ہے آپ کا زیرِ تعمیر مکان تو وہ یہی کہتے تھے کہ ۔ سے ۔

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی

مگر اب یہ تعمیری سلسلہ ایسا ختم ہوا ہے کہ اگر مہاجرین کے لئے مکانات کی تعمیر کا سلسلہ شروع نہ ہو جاتا تو یہ تمام راج مزدور معماری کا پیشہ چھوڑ کر اللہ جانے مونگ پھلی بیچنا شروع کر دیتے یا چاٹ کے خوانچے لگائے پھرتے اس لئے کہ ان عظیم الشان تعمیرات کا کام تو ایک دم سے ایسا ختم ہوا ہے کہ جیسے فالج گر جائے اگر کسی کوٹھی کے کسی کمرے کی چھت باقی تھی تو بجنسہ باقی ہے اگر کوئی دیوار دس فٹ اٹھ چکی تھی تو ساڑھے دس فٹ اٹھنا اس کو نصیب نہ ہو سکا اگر سیمنٹ کی کچھ بوریاں آ چکی تھیں تو وہ اسی طرح پڑی ہوئی ہیں مختصر یہ کہ جہاں تعمیری سرگرمیوں کا ایک شور محشر بپا رہتا تھا وہاں اب ایسا سناٹا ہے کہ گورِ غریباں کو بھی اس ویرانی پر عبرت ہوتی ہے۔ اور اب وہاں عالم یہ ہے کہ اگر کوئی کسی کو آواز دیتا ہے تو خود اپنی ہی آواز اسکے کانوں میں واپس آ جاتی ہے۔

اس ویرانی اور سناٹے کے متعلق جب لوگوں سے پوچھا تو بمشکل تمام صرف یہ معلوم ہو سکا کہ یہ زیر تعمیر قصر اور ایوان دراصل زمین میں بوئی ہوئی دولت کے پھل تھے کہ لوگ ناجائز ذرائع سے روپیہ کماتے تھے اور اس کو چھپانے کے لئے زمینیں خرید لیتے تھے اور مکانات بنانا شروع کر دیتے تھے۔ روپیہ کی تخم ریزی

کی اور وہ مکانوں کی صورت میں اگنا شروع ہو گیا مگر اب وہ آمدنی کے ذرائع ہی ختم کر دیئے گئے چھپی ہوئی دولت ہی سب کو اگل دینا پڑی تو اب یہ کوٹھیاں کہاں سے بنیں۔ ع۔

وہ شاخ ہی نہ رہی جس پہ آشیانہ تھا

ورنہ ہوتا یہ تھا کہ اس بے پناہ دولت کو جب ہضم کرنے کی کوشش کی جاتی تھی تو ہاضمہ کی خرابی یہ کوٹھیاں اگلنی شروع کر دیتی تھی۔ دنیا حیران تھی کہ اتنا تعمیری کام ہو رہا ہے راج مزدوروں کو سر کھجانے کی مہلت نہیں۔ عمارتی سامان عنقا ہو چکا ہے اور اس کے باوجود اسی کراچی میں جھگیاں بدستور موجود ہیں بے خانماں عوام اب تک بے خانماں ہیں فٹ پاتھ پر سونے والے بدستور فٹ پاتھ ہی پر سوتے ہیں آخر یہ قصہ کیا ہے مگر یہ قصہ کوئی ایسا پیچیدہ معمہ نہ تھا جو حل نہ ہوتا ان تعمیرات کا کوئی تعلق بے خانماں افراد کی آباد کاری سے نہ تھا بلکہ یہ تو دراصل اس دولت کی آباد کاری تھی جو چھپائے نہ چھپتی تھی اور سنبھالے نہ سنبھلتی تھی بنکوں میں رکھی نہیں جا سکتی تھی خود اپنے پاس محفوظ نہ رہ سکتی تھی۔ لہٰذا صرف یہی صورت تھی کہ سونے اور چاندی کو اینٹ چونے اور گارے میں ملا کر کوٹھیوں۔ محلوں اور ایوانوں کی شکل دیدی جائے اور پھر اس شکل میں بھی دولت پکار پکار کر سراغ لگانے والوں سے کہے۔ ع۔

پہچان پہ ہے ناز تو پہچان جائیے۔

مگر اب بھی عالیشان۔ پرشکوہ اور سربفلک عمارتیں بے شمار صاحبان جائداد کو اپنا مقبرہ نظر آرہی ہیں اس لئے کہ اب یہ بھی تحقیقات شروع ہو رہی ہے کہ جس نے یہ عمارت بنائی ہے وہ اپنی جائز آمدنی کے اعتبار سے واقعی "راجہ بھوج" تھا کہ ایسا محل تعمیر کرالے یا "گنگو اتیلی" تھا جس کو چاہیئے تھا کہ جھونپڑی ہیں ہم محلوں کے خواب تو جتنے چاہے دیکھ لے مگر اس خواب کی تعبیر نہ دیکھ سکے لیکن اس کے باوجود اگر اس نے ایسی عمارت بنا کر کھڑی کر دی ہے تو اس کے پاس کونسا "اسم اعظم" تھا اور اس کو الہ دین کا کونسا چراغ مل گیا تھا کہ اس کو گھسا اور دیو سے کہا کہ ہاؤسنگ سوسائٹی میں ایک محل بنا کر کھڑا کر دو گلبرگ کالونی میں ایک قصر تعمیر کر دو۔ یہ تحقیقات ایسے ایسے عقدے واکریگی کہ دنیا انگشت بدنداں رہ جائے خیر دنیا تو اب بھی انگشت بدنداں ہے کہ جن صاحب کی تنخواہ پانچ سو روپیہ ماہوار ہے ماشاءاللہ کثیر العیال بھی ہیں وہ لاکھوں کی کوٹھی آخر کہاں سے بنا کر کھڑی کر چکے ہیں۔ جن صاحب کو از روئے قاعدہ سفید پوش بھی بمشکل رہنا چاہیئے وہ ایسے چھپے رستم کہاں سے نکل آئے کہ ایک بھول بھلیاں بنائے بیٹھے ہیں اور بظاہر کوئی ذریعہ نہیں مگر نواب صاحب شیش محل بنے نظر آرہے ہیں۔

لاہور میں جب گلبرگ کالونی کی تعمیرات کا سلسلہ شروع ہوا تو پہلے تو سب ہم بخود رہ گئے کہ الہ العالمین اتنے دولت مند آخر کہاں سے آگئے جو ایسی ایسی

شاندار کوٹھیاں بناتے ہی چلے جا رہے ہیں مگر جب یہ پُر فضا کوٹھیاں بن گئیں اور ان کو قیمتی سامانِ آرائش سے عروسانہ سجاوٹ کے ساتھ مکمل کر دیا گیا تو کسی نے گلبرگ کالونی کا نام "گول مال پورہ" رکھدیا اور کسی نے رشوت کالونی۔ اس میں شک نہیں کہ اسی میں بہت سے ایسے لوگ بھی کوٹھیاں بنا چکے تھے جن کی مالی حیثیت ظاہر تھی اور جو اس قسم کی کوٹھیاں بنا سکتے تھے مگر زیادہ تعداد ان حضرات کی تھی جن کی حیثیت میں اور اس کوٹھی میں جو انھوں نے تعمیر کی تھی کوئی مناسبت نظر نہ آتی تھی اور مکان اور مالک مکان دونوں کو دیکھنے والے یہی کہہ سکتے تھے کہ "یہ مُنھ اور مسور کی دال" یعنی ۔ ع ۔

دیکھئے آپ کی اور آپ کے گھر کی صورت

اسی طرح کراچی اور دوسرے شہروں میں بھی ایسے ایسے لوگوں نے ایسی ایسی کوٹھیاں بنا کر کھڑی کر دی ہیں کہ خدا کی شان ہی نظر آتی ہے مگر اب تک تو یہ خدا کی شان ہم کو نظر آتی ہے اب اس تحقیقات کی روشنی میں یہ خدا کی شان خود ان کو نظر آئے گی اور وہ بھی قائل ہو کر رہیں گے کہ اس کے یہاں دیر ہے اندھیر نہیں چنانچہ اب وہ پریشان ہیں کہ وہ ذرائع کہاں سے بتائیں گے جن سے اس قسم کی عمارتیں تعمیر کر سکے ہیں۔ اب کوئی صاحب تو کسی لکھ پتی کے پاؤں پر گرے نظر آ رہے کہ آپ صرف اتنی اجازت دید یجئے کہ میں ولدیت کے خانہ میں آپ کا نامِ نامی

اسم گرامی دیدوں اگر آپ چاہیں تو اس عارضی ولدیت کا کرایہ بھی حسب حیثیت پیش کرسکتا ہوں۔ جو لوگ کرایہ کے متمول والدین حاصل کرنے سے قاصر ہیں وہ اپنے بھارتی عزیزوں اور دوستوں کو لکھ رہے کہ خدا کے لئے تم مجھ کو اب سے چند سال پہلے کی تاریخ کا ایک خط ہی لکھ دو کہ اتنا روپیہ سرحد پار کرا رہا ہوں اس سے ایک آدھ کوٹھی اپنے نام سے بنوا لو۔ اور اسی طرح کی تگڑموں میں یہ حضرات شب و روز مصروف ہیں۔ راتوں کی نیند اڑی ہوئی ہے اور کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس عالی شان گھر میں رہنا میسّر آئے گا یا اس سے بھی بڑی سرکاری عمارت میں رہنا پڑے گا۔ کاٹنے کو دوڑ رہے ہیں آج کل ان کو اپنے یہ مکان اور واقعی ان کا جی یہ چاہتا ہے کہ زمین پھٹ جائے اور اس میں یہ مکان سما جائیں۔

صرف گوشت کھائیے

"سستی کنک کا آٹا دو - ورنہ گدی چھوڑ دو ۔"

یہ وہ نعرہ ہے جس کی گونج آج بھارتی پنجاب میں ہر طرف موجود ہے۔ مشرقی پنجاب کی راجدھانی چنڈی گڑھ میں تو یہ حال ہے کہ دو دو اور تین تین ہزار افراد کے جلوس برابر نکلتے رہتے ہیں اور یہی نعرے بلند کرتے رہتے ہیں پچھلے جمعہ سے وہاں پانچ افراد ڈسٹرکٹ کورٹ کے سامنے بھوک ہڑتال کئے بیٹھے ہیں انھیں اسمبلی کے ایک ممبر بھی ہیں اسی جگہ پانچ سو ہڑتالی پچھلے چوبیس گھنٹہ سے اسی طرح بیٹھے بھوک میں سوکھ رہے ہیں اور ذمہ دار افسروں کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہ وہ کیونکر پاکستان کو اس پر آمادہ کرلیں کہ وہ چشم پوشی سے کام لیتا رہے اور اسمگلنگ کو جاری رہنے دے اس لئے کہ جب سے یہ اسمگلنگ بند ہوئی ہے گویا ان کی روزی کے دروازے ہی بند ہوگئے ہیں اور اس سرے سے اُس سرے تک سخت ہائے واویلا

پیٹ کون بھرے جمع کی ہوئی بارود پھانک نہیں سکتے۔ توپوں کے گولے اور کارتوس کھا نہیں سکتے۔ ویسے اللہ کا دیا سب کچھ ہے مگر کھانے پینے کی تنگی نے حال پتلا کر رکھا ہے۔

جس طرح ہم اور آپ ہفتہ میں دو دن گوشت کا ناغہ کرتے ہیں اسی طرح اب مشرقی پنجاب میں طے ہو رہا ہے کہ ہفتہ میں ایک دن سب فاقہ کیا کریں اگر اس کے باوجود غذائی حالات کی اصلاح نہ ہوئی تو ممکن ہے ۲ دو دن کا فاقہ طے ہو جائے اور اس فاقہ سے سوائے بیماروں اور معصوم بچوں کے کوئی چھوٹا یا بڑا آدمی قانوناً بخشا نہیں جا سکتا۔ ہمارے یہاں تو گوشت کا ناغہ در اصل ان کے لئے ہوتا ہے جو فریجیڈیر میں گوشت محفوظ نہیں کر سکتے ورنہ جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے فریجیڈیر دے رکھا ہے وہ ناغہ سے ایک دن پہلے ہی دو دن کا زائد گوشت منگا کر رکھ دیتے ہیں اور حسب معمول ناغہ کے دن بھی کباب اور قورمہ اڑاتے ہیں یا مرغیوں پر بزن بول دیتے ہیں اور اس طرح ناغہ کا اصل مقصد فوت ہو کر رہ جاتا ہے مگر مشرقی پنجاب میں یہ طے ہو رہا ہے کہ غلّے کا ناغہ ہوگا اور غلّہ کھاتا ہوا جو شخص بھی نظر آئے گا اس کے دونوں کانوں کے بیچ میں سر کر دیا جائے گا البتہ اس کو یہ اجازت ہوگی کہ وہ جتنا چاہے دودھ پی لے جتنے چاہے پھل کھا لے اور جتنا چاہے گوشت اڑا جائے اب آپ

یہ کہہ سکتے ہیں کہ جس کو پھل، دودھ بالائی مکھن، گوشت اور مرغ مسلّم وغیرہ میسّر ہوں اس کو کیا پڑی ہے کہ خواہ مخواہ اناج کھاتا پھرے مگر جن کو اناج میسر نہیں ہے یہ بات ان کے دل سے پوچھئے کہ اناج کیا حیثیت رکھتا ہے اور جن کو اناج نہیں ملتا ان کو یہ چیزیں کن داموں اور کس بھاؤ ملتی ہیں۔

غلّہ کی کمی نے اس دیوتاؤں کے ملک کا یہ حال کر دیا ہے کہ پیٹ کی آگ بجھانے کو مجبوراً یہ بھی کہنا پڑا کہ کہاں کا دھرم اور کہاں کی پوترتا تم زیادہ سے زیادہ گوشت کھاؤ۔ انڈے اڑاؤ مچھلی پکاؤ بس اتنی کرپا کرو کہ اناج کو بخش دو گوشت کھانے اور زیادہ سے زیادہ کھانے کی ترغیب دینا کوئی معمولی بات نہیں ہے ایسی ہی جان پر بنی ہے کہ اس ہتّھیا تک کو جائز کرنا پڑا اس لئے کہ ان کو معلوم ہے کہ محض مولیاں چبا چبا کر اور گاجریں کھا کھا کر وہ تو زندہ رہ نہیں سکتے آلو کے کچالو آخر کتنے کھائیں گے اور ان چیزوں میں غذائیت آخر کہاں سے اتنی آجائے گی کہ وہ اناج سے بے نیاز ہو جائیں اگر اناج کا تھوڑا بہت بدل ہو سکتا ہے تو وہی گوشت ہے جس کو دیکھ کر یہ لوگ "رام رام" کرنا شروع کر دیتے ہیں مگر جب بھوک کے مارے پیٹ کی آنتیں بھی رام نام کا جپنا جپ رہی ہوں تو یہ گوشت بھی ان کے لئے جائز ہو جاتا ہے چنانچہ چھپ چھپ کر گوشت کھانے والوں سے اب خوشامدیں کی جا رہی ہیں کہ چھوڑو یہ ڈھکوسلے گوشت کھانے

میں کوئی پاپ نہیں ہے مچھلی کھانے سے دھرم کا کچھ نہیں بگڑتا انڈا تو ایک قسم کی ترکاری سمجھو اور ان سب چیزوں سے پرہیز چھوڑ دو رہ گیا اناج وہ چونکہ کھیت کے بجائے چور دروازوں سے اُگ رہا تھا اور چور دروازے اب بند ہو گئے ہیں لہٰذا اس تھوڑے بہت اناج کو جو تم کو نظر آ رہا ہے غریبوں کے لئے چھوڑ کر خود انڈا مرغی کباب اڑاؤ۔

مشرقی پنجاب میں تو یہ تحریک چلائی گئی ہے مگر مغربی بنگال کا حال اس سے مختلف ہے وہاں اناج کے علاوہ انڈا مرغی وغیرہ بھی غائب ہے اس لئے کہ کلکتہ کے بازاروں میں جو انڈوں کی ریل پیل تھی اور مرغیوں سے یہ بازار مرغزار نظر آتے تھے ساری بہار بھی سچ پوچھئے تو اسمگلنگ کی تھی اب تو وہاں انڈے کی قیمت بھی اتنی بڑھ گئی ہے جتنے کی مرغی ملا کرتی تھی اب اتنے ہی کے نصف درجن انڈے ملتے ہیں رہ گئی مرغی اس کا خریدنا تو چھوٹی موٹی بکری خریدنے کے برابر ہے لہٰذا وہاں تو گوشت کھا کر بھی بھوک کی آگ کو مشکل بجھایا جا سکتا ہے لے دیکر ایک مچھلی رہ گئی ہے اس کیلئے اب جال ڈالنا پڑیں گے ورنہ اب تک تو مچھلیاں بھی خود ہی مشرقی پاکستان سے ٹہلتی ہوئی آجایا کرتی تھیں۔ مختصر یہ کہ ان حالات کو دیکھ دیکھ کر اور سُن سُن کر دل ہمارا بھی کُڑھتا ہے مگر یہ تو ہو نہیں سکتا کہ ہم مارے محبت کے اسمگلنگ شروع کر دیں اور مارے مروت کے چور دروازے پھر کھول دیں۔

خواتین و حضرات

یکم فروری کی سہ پہر کو ایک نہایت بارونق اور بھرپور مشاعرہ سید گرلس کالج کے زیر اہتمام منعقد کیا گیا جس میں علاوہ شعرائے کراچی کے لاہور پشاور اور دیگر کئی مقامات کے سرآوردہ شعرا نے حصہ لیا۔ اس بزم مشاعرہ میں جو خطبہ صدارت میں نے پیش کیا ہے وہ ناظرین وغیرہ وغیرہ کی امانت کی حیثیت رکھتا ہے لہٰذا ایک دیانتدار امین کی طرح وہ خطبہ من وعن پیش کر رہا ہوں:

پرنسپل صاحبہ، شعرائے کرام۔ خواتین و حضرات!

ایک زنانہ کالج کے مردانہ مشاعرہ کی صدارت کا منصب عطا فرما کر اللہ جانے آپ نے میری عزت افزائی فرمائی ہے یا مزاح لطیف سے کام لیا ہے بہر حال میں بکمال سنجیدگی آپ کا شکر گذار ہوں اور اس شکر گذاری کے اظہار کو اس لئے مختصر سے مختصر تر بنانا چاہتا ہوں کہ کہیں یہ سنجیدگی بھی کسی تمسخر کی شکل

اختیار نہ کرے۔

خواتین وحضرات! میں نے آج ہی نہیں بلکہ اکثر اس مسئلہ پر غور کیا ہے کہ شاعری کے عہد حاضر کو الخطاطی دور کہنا منجملہ دوسری وجوہ کے اس وجہ سے بھی کس قدر غلط ہے کہ شاید اس دور سے زیادہ کسی اور دور نے اتنی شاعرات پیدا نہیں کیں جتنی آج نظر آتی ہیں۔ اللہ جانے مبصرین شعر و ادب اس کو شاعری کا ارتقار سمجھتے ہیں یا تنزل کہ خواتین بھی بال بچوں کی فکر کے علاوہ فکر سخن میں مبتلا نظر آتی ہیں مگر میں اس کو ارتقا ہی کہہ سکتا ہوں کہ جہاں تک شاعری کا تعلق ہے۔ ع۔

مردانہ سے زیادہ زنانہ میں دھوم ہے

شروع شروع میں یہ بات مجھے بھی عجیب و غریب نظر آئی تھی کہ مشاعروں میں خواتین نے بھی پہلے سامع کی حیثیت سے حصہ لینا شروع کیا۔ پھر وہ صف شعراء بھی چھا پہ مارتی نظر آئیں اور رفتہ رفتہ مخلوط تعلیم نے جس رفتار سے فروغ حاصل کیا مخلوط مشاعرے بھی ترقی کرتے نظر آنے لگے یہاں تک کہ خدا نے یہ دن بھی دکھا دیا کہ خواتین کے مشاعرے میں مرد شعراء آٹے میں نمک کی مناسبت سے شریک نظر آرہے ہیں۔ اس مشاعرے میں آٹے اور نمک والی بات ہر چند کہ بیباختگی کے ساتھ آگئی ہے مگر جب آہی گئی ہے تو اس سے فائدہ کیوں نہ اٹھایا جائے۔ میں آج یہ اعتراف کرنا چاہتا ہوں کہ اب تو میں چشم بد دور بڑا

روشن خیال بن چکا ہوں ورنہ جب شروع شروع میں مجھ کو خواتین سرِ مشاعرہ غزل سرائی کرتی ہوئی نظر آئیں تو میں نے خود اپنے لئے ہنڈ کلھیا پکانے کے امکان پر غور کیا تھا۔ وجہ اس کی یہ تھی کہ ادبِ اردو کی کسی تاریخ میں مجھ کو کہیں ایسے مشاعرے کا پتہ نہیں چلا جس میں غالبؔ کے علاوہ کسی غالبا نے بھی شرکت کی ہو اور مومن کے علاوہ کسی مومنہ نے بھی شعر سنا کر داد حاصل کی ہو۔ بلکہ میری نظر میں تو وہ مشاعرے تھے جن میں مردوں کے علاوہ عورتوں کا دور دور پتہ نہ ہوتا تھا۔ پھر وہ مشاعرے شروع ہوئے جن کے اشتہاروں میں لکھا جانے لگا کہ خواتین کے لئے پردے کا خاص انتظام ہے اور رفتہ رفتہ اسی کراچی میں ایک ایسا مشاعرہ بھی منعقد ہو گیا جس میں مردوں کے لئے پردے کا خاص اہتمام تھا۔ میں اپنے دوست حضرت ظریف جبلپوری سے آپ کو وہ نظم سنوانے کی کوشش کروں گا جس نے اس زنانہ مشاعرے کو جس میں مرد شعراء کو پردہ نشین بنایا گیا تھا تاریخی حیثیت دی گئی ہے مگر اب اس قسم کے مخلوط مشاعرے ہمارا معمول بن چکے ہیں۔ خدا نظرِ بد سے بچائے شاعرات کی اب کوئی کمی نہیں ہے اور ان میں ایسی ایسی باکمال شاعرات بھی موجود ہیں جو شاعروں میں حاصل مشاعرہ نتائج فکر پیش کر کے مردوں سے خراجِ تحسین حاصل کر ہی لیتی ہیں۔

یہ بات ان بزرگوں کے نزدیک تعجب انگیز ضرور ہے جو فن کو بھی جنس وار تقسیم کرتے ہیں اور شاعری کو بھی پہلوانی کی طرح خالص مردانہ فن گردانتے ہیں۔

حالانکہ زمانہ وہ آگیا ہے کہ پہلوانی بھی خالص مردانہ فن باقی نہیں رہا ہے۔ آپ نے مشہور خاتون پہلوان حمیدہ بانو کا نام سنا ہوگا جس سے بڑے بڑے پہلوان پناہ مانگتے تھے آپ نے تارا بائی کا نام سنا ہوگا جس نے رام مورتی کو اس طرح آئینہ دکھایا تھا کہ وہ ایک موٹر کو روک لینا اور اپنی گرفت میں لیکر جنبش میں نہ آنے دینا اپنا کمال سمجھتے تھے تو ان محترمہ نے دو موٹروں کو بیک وقت روک کر ثابت کردیا کہ یہ کمال صرف دہنے ہاتھ کا نہیں بلکہ ایک عورت کے بائیں ہاتھ کا بھی کھیل ہے۔ آپ ان محترمہ بزرگوں سے کہہ سکتی ہیں کہ عورت کے شاعر ہونے پر اعتراض کرنے سے پہلے ذرا دوسرے شعبوں میں بھی عورتوں کی رسائی دیکھ لیں۔ اگر زنانہ پولیس ممکن ہے تو خواتین کی شاعری پر تعجب کیوں ہے۔ خواتین اگر رائفل کلب میں نشانہ بازی کر سکتی ہیں تو مشاعروں کی شرکت سے ان کو کون روک سکتا ہے۔ فوجی محکموں میں اگر خواتین آسکتی ہیں تو ہمارے بزرگ ان کو مشاعروں میں دیکھ کر کلجگ کیوں یاد کرنے لگتے ہیں۔ عورت اگر لیڈری کر سکتی ہے تو شاعری کیوں نہیں کر سکتی یہ اور بات ہے کہ میرے ایک نہایت ہی شفیق بزرگ۔ ڈاکٹر اینی بسنت کو زندگی بھر مرد سمجھتے رہے اور جب ان کو بتایا گیا کہ وہ خاتون تھیں تو احمق سمجھ کر بولے کہ جناب والا وہ خاتون ہوتے تو لیڈی ڈاکٹر اینی بسنٹ ہوتے۔ اس واقعے کو جسے آپ نے لطیفہ سمجھا ہوگا یہاں دوہرانے کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ میں خواتین

کی شاعری کا اول تو مخالف نہیں ہوں اور اگر مخالف ہوتا بھی تو ایک زنانہ کالج میں اس کی مخالفت کا اظہار نہ کرتا۔ البتہ میں یہ ضرور چاہتا ہوں کہ خواتین کے اسم مبارک یا تخلص کے علاوہ لیڈی ڈاکٹر قسم کی کوئی چیز ضرور ہونا چاہیئے تاکہ ادب کا مورخ تاریخ میں مردوں کو عورت اور عورتوں کو مرد نہ بنادے مثلاً شمیم ایک مرد کا بھی تخلص ہو سکتا ہے اور ایک عورت کا بھی خود شوکت اللہ جانے کس دن کسی خاتون کا تخلص واقع ہو جائے اور ان کا ذکر تاریخ میں اس طرح آئے کہ یہ شوکت نہایت صاحب اولاد بزرگ تھے مزاح نگاری کی حیثیت سے ادب میں داخل ہوئے اور مزاحیہ شاعری کی آغوش میں رحلت پائی۔ اور خود میرا ذکر تاریخ میں اس طرح آئے کہ یہ محترمہ بڑی شرمیلی واقع ہوئی تھیں مشاعروں میں برقعہ پہنکر شعر سناتی تھیں اور رواد ملنے پر ان کے شوہر سلام کرتے تھے۔ اس تمام گڑبڑ سے محفوظ رہنے کیلئے میری تجویز بھی ہے کہ شاعرات کے لئے لیڈی شاعر یا نام سے پہلے لفظ "شاعرہ" کا آنا ضروری ہے تاکہ تاریخ میں جنسی تبدیلی نہ ہونے پائے۔

خواتین و حضرات! میں مزاحاً نہیں بلکہ واقعی خواتین کی شعر گوئی کا مخالف نہیں ہوں البتہ خواتین یا تو غزل کے اسلوب کو اپنے حسب حال بنالیں یا نظمیں کہا کریں۔ کچھ عجیب لغو سی بات معلوم ہوتی ہے جب کوئی شاعرہ اس قسم کا شعر پڑھتی ہے کہ۔

ترے عشق کی انتہا چاہتا ہوں
مری سادگی دیکھ کیا چاہتا ہوں

تو یہ عجیب مضحکہ خیز سی بات معلوم ہوتی ہے۔ یہ مونچھوں والے شعر عورتوں کو زیب نہیں دیتے لہذا وہ "چاہتا ہوں" کو "چاہتی ہوں" تو آسانی سے بنا سکتی ہیں مگر اس کے باوجود یہ زنانہ شعر مشکل بن سکتا ہے اور اس میں نسائی وقار باقی نہیں رہتا۔ یہ بحث طویل ہے میں صرف اس اشارے ہی کا م لیکر اس کو تشنہ چھوڑنے پر مجبور ہوں اس لئے کہ اب حاضرات و حاضرین مجھ کو مشاعرے کا پیپر ویٹ سمجھنے لگے ہیں لہذا میں اس مشاعرے کی ابتدا کا اعلان کرتا ہوں۔

روٹی کپڑے کا دعویٰ

شوہرانِ ملک وملت طرح طرح کی خود فریبی میں مبتلا ہیں کہ وہ خداوند بن سکے مگر خدا کی ایک بندی کے مجازی خدا تو ہیں ہی جو ان کو "سرتاج من سلامت" قسم کے القاب وآداب سے خط لکھتی ہے اور اپنے سرتاج کی خود سلیپر بنکر رہتی ہے مگر ان شوہروں نے کاش کبھی اس بات پر غور کیا ہوتا کہ یہ عزت واعزاز، یہ اقتدار اور دبدبہ ان کو کس قدر مہنگا پڑتا ہے۔ سب سے پہلے تو اس مجازی خداوندی کی قیمت ان کو مہر کی شکل میں ادا کرنا پڑتی ہے خواہ وہ مہر معجل ہو یا موجل یعنی یا تو وہ مہر فوراً ادا کرتے ہیں یا قرض کا بار اپنے سر لے لیتے ہیں اس کے بعد نان نفقہ کی ذمہ داری بھی ان کو قبول کرنا پڑتی ہے اور اگر اس ذمہ داری کو پورا کرنے میں وہ ذرا بھی کوتاہی کریں تو بیبی پیر کی جوتی ایسی سر کو آتی ہے کہ ساری مجازی خداوندی دھری رہ جاتی ہے اور روٹی کپڑے کا دعوی دائر ہو جاتا ہے صرف یہی نہیں بلکہ اگر اہلیہ محترمہ کو چھوڑنا بھی چاہیں تو بچوں کی کفالت کی ذمہ داری

سے گردن نہیں چھوٹتی اور بیوی کو چھوڑنے کے بعد بھی بچوں کا خرچ تو دینا ہی پڑتا ہے۔ یا بیوی کو چھوڑنے کی نوبت نہ آئے بلکہ بیوی خود ان حضرت پر لعنت بھیج کر میکے جا بیٹھے تو بھی ان حضرت پر نان نفقہ کا دعویٰ ہو جاتا ہے اور ان کو بیوی بچوں کے اخراجات ادا کرنا پڑتے ہیں۔

قصہ کوتاہ بن تو جاتے ہیں مارے شوق کے مجازی خدا مگر پھر زندگی بھر طبیعت ایسی صا ہوتی ہے کہ اپنی اس خدائی سے خود نجات نہیں ملتی۔ برعکس اس کے وہ ممالک ہیں جہاں بظاہر تو شوہر اپنی بیوی کی اہلیہ بنا ہوا نظر آتا ہے دیکھنے والوں کو یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ حضرات اپنی بیوی کے زیادہ سے زیادہ "پرائیوٹ سکریٹری" ہیں مگر یہ "فدوی" نظر آنے والے شوہر بے شمار ذمہ داریوں سے آزاد ہوتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ مغربی بیویاں موٹروں اور شوہروں میں بہت ہی کم فرق سمجھتی ہیں اور وہ موٹروں کے علاوہ اپنے سیکنڈ ہینڈ شوہر کو بھی چھوڑ نئے ماڈل کا شوہر جب چاہتی ہیں حاصل کر لیتی ہیں اور ان حالات میں ان نیلام پر چڑھے ہوئے شوہروں کی کیفیت اکثر نہایت دردانگیز ہو جاتی ہے مثلاً یہ کہ وہ بیمار ہو گئے اور بیوی نے ان کو بستر علالت ہی پر چھوڑ کر خواپنے لئے کسی تندرست شوہر کی جستجو شروع کر دی یا وہ کسی حادثے کا شکار ہو کر کچھ لنگڑے لولے وغیرہ ہو گئے اور بیوی نے ان کو ناقابل مرمت سمجھ کر بجائے ورکشاپ میں

کے یہی مناسب سمجھا کہ ایک نئے ڈزائن اور نئے ماڈل کا شوہر ہی حاصل کر لیا جائے
یہ حالات ایسے ہیں کہ مغربی ممالک کے شوہروں کی حالتِ زار پر ترس آتا ہے اور
جی چاہتا ہے کہ وہ حیوانات پر بے رحمی کرنے کے انسدادی قانون ہی کے
تحت کسی طرح آجائیں ۔

یہ حالات اس حد تک مغربی ممالک میں دردانگیز ہو چکے ہیں اور بیویوں کی
طرف سے شوہر آزاری اس حد تک بڑھ گئی ہے کہ اب برطانوی حکومت ایک
ایسے قانون پر غور کر رہی ہے جس کے نفاذ کے بعد طلاق حاصل کرنے والی
عورتوں کو اب یہ آزادی حاصل نہ رہے کہ وہ شوہر کو دودھ کی مکھی سمجھ کر جب
چاہیں گھر سے نکال دیں یا جب جی چاہے شوہر کو ٹیلیفون کر دیں کہ سنو میاں ؏

بس اب خانہ آباد دولت زیادہ

میں گھر واپس نہیں آ رہی ہوں اس نئے قانون کے ماتحت ان طلاق
حاصل کرنے والیوں کو اپنے متروکہ شوہروں کو گذارہ دینا پڑے گا۔ یہ گذارہ
کسی حالت میں پانچ پونڈ فی ہفتہ سے زیادہ نہ ہوگا یعنی تقریباً ستّر روپے فی
ہفتہ۔ صاحب اچھی خاصی رقم ہوگئی یعنی تقریباً ساڑھے تین سو روپے ماہوار
مگر اس گذارے کے حصول کے لئے ہر شوہر کو یہ ثابت کرنا پڑے گا کہ وہ اس کا
مستحق ہے یعنی اس کو ضعیفی کی وجہ سے بیوی نے چھوڑ دیا ہے لہٰذا اس کو بیوی

سے پنشن دلوائی جائے یا بیماری کی وجہ سے بیوی نے چھوڑ دیا ہے تاکہ وہ بیوہ نہ ہونے پائیں یا کسی اور ایسی ہی وجہ سے چھوڑا ہے جس میں شوہر کا کوئی ذاتی قصور نہ تھا مثلاً چیچک نکل آئی اور وہ حضرت بدصورت ہو گئے یا گر پڑے اور ٹانگ وغیرہ ٹوٹ گئی۔ ان حالات میں بیوی پر فرض ہو گا کہ وہ گذارہ مقرر کرے۔ البتہ اگر دونوں میں مارپیٹ ہوئی ہو یا اتنا شوہر نے عاجز کیا ہو کہ وہ مجبور ہو گئی ہو طلاق پر تو ان عورتوں میں گذارے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔

عام طور پر گذارہ اُن شوہروں کو ملا کرے گا جو اس قابل نہ رہ گئے ہوں کہ کوئی عورت ان کو التفات کا مستحق سمجھے اور بحیثیت شوہر قبول کرے۔ یہ لوگ بحیثیت شوہر کے رٹائر کئے جائیں گے تو ان کو پنشن ضرور ملے گی یا ان جوان شوہروں کو یہ گذارہ مل سکے گا جن میں بظاہر کوئی عیب نہ تھا نہایت سعادت مند ہونہار شوہر تھے ہر خوبی جو ایک شوہر میں ہونا چاہیئے تھی ان میں موجود تھی مگر چونکہ بیگم صاحبہ کی خواہش یہ تھی کہ "خوب سے خوب تر" ملے لہٰذا وہ ان سے بھی زیادہ کسی کی خوبیوں سے متاثر ہو کر اسکی ہو رہیں تو یہ سودا کرتے ہوئے ان کو متروکہ شوہر کے ساتھ انصاف کرنے پر غور کرنا پڑے گا اور اس کو گذارہ مقرر کرنا پڑے گا خواہ وہ بھی دوسری شادی کیوں نہ کر لیں۔ اور ان

یاوفا شوہروں کو بھی اس گنڈاردے کا مستحق سمجھا جائے گا. جو بیوی سے یہ کہہ دیں کہ تم شوق سے شادی کرو مگر میں تمہارے ہی نام پر بیٹھا رہونگا۔

کتنا فرق ہے ہم مجازی خداؤں میں اور ان نیازمند بلکہ "عبدالزوجہ" شوہروں میں۔ یعنی ہم یہاں پر نان ونفقہ کا دعوے ہو سکتا ہے اور وہاں شوہر یہ دعوے بیویوں پر کر سکتے ہیں یہاں ہم روٹی کپڑے کے ذمہ دار ہیں وہاں شوہر الگ کما تا ہے۔ بیوی الگ نوکری کرتی ہے انس کو اس کی آمدنی سے کوئی سروکار نہیں اس کو اس کی آمدنی سے کوئی مطلب نہیں بہت ہی عشق ہوا تو مل جل کر رہ لیے ورنہ وہ علیحدہ ہوٹل میں کھانا کھاتی رہی گی یہ الگ اسپتال میں مرتے رہیں گے وہ الگ کلب میں ناچے گی یہ الگ تنہائی میں تگنی کا ناچ ناچتے رہیں گے اور جب کبھی آمنا سامنا ہو گیا تو ایک دوسرے سے ہاتھ کہہ کر مل بھی لیں گے اور یا نہ بھی آجائے گا کہ ہم دونوں تو شائد آپس میں میاں بیوی بھی ہیں یا اگر بچے ہو گئے تو ان کو بتانے کے لیئے یہ یاد رکھنا پڑتا ہے کہ تمھارا ایک باپ بھی ہے کسی دن آئے گا تو تم کو دکھا دیں گے۔

مصیبت ساری یہ ہے کہ ہم مجازی خداؤں کی یہ حقیقی بندیاں ایسی گھر والیاں ہوتی ہیں کہ ان بیچاریوں کو واقعی ہمارے رحم کرم پر رہنا پڑتا ہے

یعنی اگر ہم کما کر نہ لائیں تو وہ بھوکی مر جائیں لہٰذا ان کو زیر دست رہنا پڑتا ہے خواہ ہم کیسی ہی زبردستی کیوں نہ کریں مگر وہ خواتین تو خود کفیل ہوتی ہیں ان کو شوہر کی کمائی کی کیا پروا۔ یہی وجہ ہے کہ ان میں خود شوہرانہ شان ہوتی ہے اور چونکہ یہ شان روز بروز بڑھ رہی ہے اور وہ شوہروں کو نیلام پر چڑھائے ہوئے ہیں کہ آج خرید اکل بدل دیا لہٰذا ضرورت اسکی پیش آتی ہے کہ شوہروں کے حقوق کا بھی تحفظ کیا جائے تاکہ وہ بے موت نہ مر سکیں۔ اب جب اس قانون کے ماتحت ان محترمات کو شوہر کا گذارہ دینا پڑے گا تو وہ ذرا سمجھ بوجھ کر طلاق کا نام لیا کریں گی اور طلاق حاصل بھی کریں گی تو شوہر یہ تو کہہ سکیں گے کہ میں فلاں خاتون کا پنشنر شوہر ہوں۔
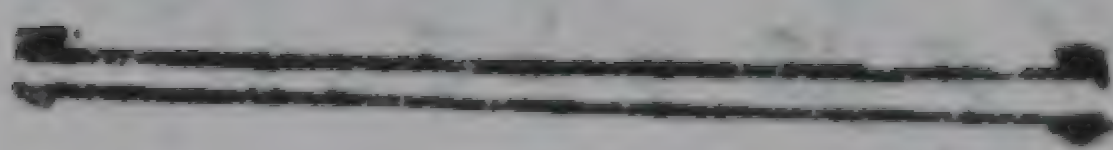
ریل کا ہم سفر ——؟

جاڑے کا سفر سائیں سائیں کرنے والی رات میں شائیں شائیں کرنے والی ٹرین اور شریک سفر بھی کون؟

ع زبان پہ بارِ خدا یا یہ کس کا نام .....

مگر نہیں، ٹھہریئے تو سہی۔ نام کا بھلا ہم کو کیا پتہ؟ نام تو نام صورت تک نہیں دیکھی تھی۔ البتہ اتنا معلوم تھا۔ کہ حسین ہے اور بجید حسین۔ اسکی دلفریبی کی قسم بغیر دیکھے ہوئے اسی طرح کھا سکتے تھے۔ جس طرح بغیر دیکھے خدا کی سچی تو سچی جھوٹی قسمیں بھی جب جی چاہے کھا سکتے ہیں۔ ادغوانی رضائی جس پر کامدانی کے ستارے بکھرے ہوئے تھے۔ اس پیکرِ ناز کے حسن کو چھپا چھپا کر چمکا رہی تھی۔ یہ رضائی لکھنؤ کی بنی ہوئی تھی۔ اس لیے کہ رضائی میں کامدانی بنانے کا سلیقہ اور سلیقہ سے زیادہ فرصت کسی شہر کو کہاں

نصیب ہو کا سی گوٹے میں سلمے ستارے کا وہ کام جو دیکھنے والوں کی نظروں کو جھپکائے بغیر نہیں رہ سکتا۔ قسمت ہو تو ایسی کہ مقابل والی سیٹ پر ہم کو بھی نہایت کشادہ جگہ مل گئی۔ صرف ایک مسافر کونے میں سکڑا ہوا بیٹھا تھا۔ جس کے پاس اوڑھنے کو کچھ نہ تھا۔ دھوتی کا پینچ کھول کر پیروں پر ڈال لیا تھا تاکہ دل کو یہ سمجھا سکے کہ ہم بھی کچھ اوڑھے ہوئے ہیں۔ اس شخص کو بیٹھنا ہی چاہیے تھا۔ اس لیے کہ اگر لیٹ جاتا تو واقعی سردی لگ جاتی۔ سردی تو خیر اب بھی لگ رہی ہو گی مگر جتنی لگنا چاہیے تھی۔ اتنی نہ لگ رہی ہو گی۔ بہرحال اس شخص کے متعلق غور کرنے کی فرصت ہی کسے تھی۔

ہولڈال کو کھول کر سیٹ پر اپنا قبضہ جما لیا۔ اور یہ غور کرنے لگے کہ آج کس کا منہ دیکھ کر اٹھے تھے۔

ذرا غور تو کیجیے ایک حسین عورت تن تنہا۔ اور پھر لمبا سفر۔ لمبے سفر کا اندازہ سونے کے انداز سے ہو رہا تھا۔ کیسی بے فکری کی نیند تھی۔ واقعی جوانی سو رہی تھی۔ سچ مچ حسن حفاظت کر رہا تھا۔ جی چاہتا تھا کہ اس وقت کہیں سے ایک ستار مل جائے اور خواب ناز کے متعلق جتنی ٹھمریاں، دادرے یا غزلوں کے اشعار ہم کو یاد ہیں سب گا کر رکھ دیں۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ روح گنگنا رہی ہے اور ہم جھوم رہے ہیں یا ہم جھوم رہے ہیں اور ہم ہی گنگنا رہے ہیں یا روح جھوم رہی ہے اور ہم گنگنا رہے ہیں۔ بہرحال جھومنا اور گنگنانا

بالکل یقینی تھا۔ البتہ تقسیم کار کا صحیح اندازہ اس وقت آسانی سے نہیں ہو سکتا تھا ہم نے اسی عالم جذب و سکر میں اپنے ہولڈ آل کو بہت قرینہ سے سیٹ پر لگا دیا قرینہ سے مطلب یہ کہ ریشمی سوزنی جو پہلے سب سے نیچے رکھی ہوئی تھی تاکہ سفر میں خراب نہ ہو سب سے اوپر بچھا دی تاکہ جب وہ اپنی دلفریب رضائی کا ایک گوشہ اٹھا کر اپنے ہو شربا مکھڑے کو بے نقاب کریں تو بستر کی کم حیثیتی سے ہمارے متعلق کوئی ایسی رائے قائم نہ کریں کہ ہم کو اس رائے میں تبدیل کرانے میں خواہ مخواہ کچھ وقت صرف کرنا پڑے پھول دار تکیہ اوپر اور سادہ نیچے رکھ دیا۔ ولایتی کمبل نکال کر سوزنی کمبل ہولڈ آل کی جیب میں رکھ دیا۔ ارادہ تھا کہ بس یہی کپڑے پہنے ہوئے لیٹ جائیں مگر اب یہ رائے تبدیل کر دی شب خوابی کے ریشمی سوٹ کی ضرورت نہایت شدت کے ساتھ محسوس ہوئی ورنہ ظاہر ہے کہ وہ یہی کہتیں اپنے دل میں کہ عجیب جانگلو ہے جس کے سونے اور جاگنے کا ایک ہی لباس ہوتا ہے۔ ہائے اس وقت ڈریسنگ گون نہ ہوا۔ وہ اونی نہ سہی ریشمی سہی مگر کچھ تو بہار دے ہی جاتا۔ بہر حال لیٹ گئے۔ رضائی کی طرف ہمہ تن توجہ اور رضائی اٹھنے کے ہمہ تن منتظر۔

اس کا حسین ہونا تو خیر طے تھا۔ کاش حسن کے ساتھ ہی نا کتخدا بھی ہو۔ تاکہ..... مگر خیر یہ بات تو بہت قبل از وقت ہے معلوم نہیں اس کے والدین اس کی نسبت کو منظور بھی کریں گے یا نہیں۔ لیکن ایک بات ہے کہ والدین کا تو کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس لیئے کہ وہ اس قدر آزاد خیال ہے کہ تنہا

سفر کر رہی ہے۔ اور نا کتخدا بھی اس لیے ہے کہ نہ تو کوئی بچہ ہے اور نہ بچے کا باپ یہ بھی سمجھنے کی بات ہے۔ کہ اگر اس حسینہ کی خدانخواستہ شادی ہو چکی ہوتی تو ایسی حسین بیوی کو تنہا سفر کرنے کی اجازت مشکل ہی سے کوئی شوہر دے سکتا تھا۔ تو گویا اسکی شادی نہیں ہوئی ہے۔ مگر ایک مصیبت یہ بھی تو تھی کہ ہماری شادی ہو چکی تھی مگر سنیئے تو سہی اگر ہو بھی چکی تھی تو کیا؟ اول تو اس بیچاری کو اسکی خبر ہی کیونکر ہو سکتی ہے اور خبر ہو بھی تو دوسری شادی کوئی گناہ تو ہے نہیں۔ شفقت ماموں نے دوسری شادی کی تھی۔ پہلی بیوی میکے میں رہتی تھیں۔ اور دوسری بنگلہ میں، ان کو عدالت کی مقرر کی ہوئی رقم دی جاتی تھی اور ان کو سب کچھ۔ ان کے بچوں کے بھی یہی باپ تھے اور ان کے بچوں کے بھی۔۔۔۔۔ مگر صاحب یہ دھوتی اوڑھنے والا اور سردی میں سکڑنے والا مسافر بھی عجیب بے حس تھا۔ یعنی اس کو سونے اور سردی کھانے کے علاوہ گویا اسکی خبر ہی نہیں تھی کہ عین اسکے سامنے ہی ایک فتنہ بیدار ہے اور فتنہ گر محوِ خواب، حالانکہ از روئے قاعدہ اس بے بستر مسافر کو ہم سے زیادہ خوش نصیب ہونا چاہیئے تھا اس لیئے کہ یہ پہلے ہی سے ان کا ہمسفر تھا جن کے شریک سفر ہونیکی سعادت ہم کو اب حاصل ہوئی تھی اور قرینہ یہ بتا رہا تھا کہ یہی سفر ہمارا حاصل زندگی بن کر رہیگا۔ لیٹے لیٹے ایک دم سے خیال آیا کہ یہ جو ہم سگریٹ پی رہے ہیں اسکا درجہ بیڑی سے کچھ یونہی سا بلند ہے اور سب سے بڑا نقص اس کمبخت سگریٹ میں یہ ہوتا ہے کہ ناظرین کو اس بات

کا اندازہ کرایا ہی نہیں جا سکتا، کہ یہ سگریٹ ایک آنہ پیکٹ والا نہیں، بلکہ ڈھائی آنہ والے ڈبے والا ہے۔ اسکی لے دیکر بس یہی ایک ترکیب ہے کہ سگریٹ لبوں میں دبا کر اسکا ڈبہ آدمی اپنے ہاتھ میں لیے رہے۔ سگریٹ ایک سرے سے نہ پینا بھی اپنے کو بیوقوف ثابت کرنے کے برابر ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ نہایت آسانی سے یہ سوچ سکتی تھیں کہ جس شخص میں ابتک سگریٹ پینے تک بلوغ نہ پیدا ہوا اسمیں ایک عورت کی پذیرائی کا شعور کیونکر ممکن ہے یاد آیا کہ اٹیچی میں پائپ رکھا ہوا ہے۔ ایک دم اچھل پڑے طبیعت باغ باغ ہو گئی یعنی۔

ع — "پسلی پھڑک اٹھی نگہ انتخاب کی"

واقعی پائپ اس قسم کے مواقع کے لیے نہایت آزمودہ چیز ہے۔ پائپ پینے والے کی طرف عورت اس طرح کشاں کشاں آتی ہے جس طرح .... جس طرح .... خیر.... اس وقت کوئی تشبیہ یاد نہیں آرہی ہے۔ بہرحال عورت پائپ کی طرف کھنچتی ضرور ہے ہم نے بستر سے اُٹھکر فوراً اٹیچی میں سے پائپ نکالا۔ تمباکو کا ڈبہ برآمد کیا اور اپنے حسین شکار کے لیے پائپ سے مسلح ہو کر پھر لیٹ گئے۔

معلوم نہیں اس قسم کے امتحانی مواقع پر سب کا دماغ اس قدر حاضر ہو جاتا ہے یا قدرت نے یہ خصوصیت ہم ہی کو عطا کی ہے کہ بلا کی سوجھ بوجھ ہو جاتی ہے۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر نظر فوراً پہونچ جاتی ہے مثلاً اس وقت ہم کو یہ خیال آیا کہ ہم روشنی کے رخ پر لیٹے ہوئے نہیں ہیں اور ہمارے چہرہ پر اندھیرا ہے اگر ہم

اس رخ کو بدل دیں۔ یعنی تکیے اس طرف رکھدیں جدھر فی الحال پائینتی ہے۔ تو چہرے پر روشنی پڑنے لگے گی اور دیکھنے والے کو رنگ نکھرا ہوا نظر آئیگا۔ یاد رکھیے کہ بجلی کی روشنی رنگ کے لیے نہایت مجرب تسلیم کی گئی ہے اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی مانی ہوئی بات ہے کہ یہ سانولا سلونا رنگ ہوتا ہے نا۔ اس کو اگر اندھیرے میں دکھا جائے تو چہرے کا نمک کالا نمک نظر آتا ہے اور بلا وجہ انسان کو سیاہ فام ہونے کی ندامت برداشت کرنا پڑتی ہے۔ آپ سمجھ سکتے ہیں کہ یہ موقع اس قسم کی ندامت کا نہ تھا۔ ہم نے فوراً ہولڈال کا رخ بدل دیا۔ اور رخ روشن کے آگے شمع رکھ کر دل ہی دل میں کہنے لگے کہ دیکھیں اب ادھر جاتا ہے پروانہ یا ادھر آتا ہے ــــ

مگر صاحب قیامت کی جوان اور الھڑ، الھڑ اور جوان نندیر تھی کہ کروٹ تک بدلنے کا ہوش نہ تھا۔ ٹرین کی جنبشوں سے رضائی کے ریشم میں ہلکی ہلکی لہریں پیدا ہو رہی تھیں۔ اور ان لہروں کی وجہ سے کامدانی اور جگمگ جگمگ ہو رہی تھی معلوم ہوتا تھا کہ کسی لالہ زار میں کسی بہت بڑے سرمایہ دار جگنو کی برات آئی ہوئی ہو۔ یا بحیرۂ احمر میں ایک دم سے تمام ستارے غسل کرنے کیلیے اتر آئے ہیں مختصر یہ کہ رضائی جاگ رہی تھی اور رضائی والی تھی کہ کسی طرح جاگنے کا نام ہی نہ لیتی تھی اور یہاں دماغ تھا کہ اسکے جاگنے کے بعد پیش آنے والے واقعات کے تصوروں کا گویا میلہ لگائے ہوئے تھا۔ تقریب ملاقات کی بیشمار تجویزیں ذہن میں آ آ کر رد ہو رہی تھیں۔ تعارفی مکالمے کے ریہرسل پر ریہرسل دل ہی دل میں ہو رہے تھے۔ اپنے سوالات کے ساتھ ہی ساتھ ان کے

جوابات بھی ذہن رسا خود ہی دے رہا تھا کہ ہم ان سے کہیں گے۔

ہم۔ "معاف کیجئے گا غالباً دو بجے ہوں گے۔"

وہ۔ "جی ہاں شاید چار ابھی نہیں بجے۔"

ہم۔ "تو آپ بھی بھوپال تشریف لے جا رہے ہیں؟"

وہ۔ "جی ہاں! تو کیا آپ بھی بھوپال جا رہے ہیں۔؟"

ہم۔ "جی ہاں بھوپال، مجھ کو وہاں کی ایک ادبی انجمن کے سالانہ اجلاس کی ایک نشست کی صدارت کرنا ہے۔"

وہ۔ "جناب کا اسم مبارک؟"

ہم۔ "مجھے کاشف الکلامی الہابڑی کہتے ہیں۔ روزنامہ غروب کا مدیر اعلیٰ ہوں۔"

وہ۔ "اوہ۔ اوہ۔ آپ ہی کاشف صاحب ہیں۔ میں نے تو آپ کا نام اکثر سنا ہے۔ آپ کی کتاب "شکور و نصیبن" میرے کتب خانہ میں موجود ہے۔ بڑی مسرت ہوئی آپ سے مل کر۔"

ہم۔ "جو الفاظ میرے جونت دماغ میں محدود تخیل تھے۔ وہ آپ نے ارشاد فرمادیئے اب میں اپنے جذبہ مسرت کو معذور تکلم پاتا ہوں۔ اور زبان بے زبانی ہی کو ترجمانی کا ذریعہ بناتا ہوں۔"

وہ۔ "ماشاء اللہ صرف قلم ہی میں جادو نہیں بلکہ گفتگو میں بھی وہی تحریر والا سحر موجود ہے۔"

"میں دریافت کر سکتا ہوں۔ کہ آپ کا...... یعنی...... اسم...."

"جی میرا نام ناہید درخشاں ہے۔ میرے والد خان بہادر طغرل خاں کا نام آپ نے سنا ہوگا۔"

اچھا....... اچھا....... اور آپ کے.......

جی نہیں بس اور میرے کچھ نہیں۔ میں ابھی........

رعنائی میں یکایک جنبش ہوئی۔ اور یہاں ہمارا اور پرسل ختم۔ بالوں پر ایک ہاتھ پھیر کر دل ہی دل میں کہا۔ ع آخر آمد زپس پردۂ تقدیر پدید! مگر وہ جنبش کامرانی کے ستاروں کو جگمگا کر رہ گئی، ایک لہر سی آئی اور پھر سطح پر سکون طاری ہو گیا مگر یہ اچھا ہی ہوا اس لیے کہ ایک نہایت شدید غلطی کا فوراً احساس ہم کو ہوا کہ ہم نے یہ کیا غضب کیا تھا کہ سر پر ہاتھ پھیر کر بالوں کو درست کرنے کی کوشش کی۔ حالانکہ یہ بات ہم کو پہلے سے معلوم تھی کہ خواتین عام طور پر بنے سنورے بالوں کو پسند نہیں کرتیں بلکہ وہ مرد کے بالوں میں ایک مستقل ژولیدگی دیکھنا چاہتی ہیں۔ روکھے روکھے سے بال تھوڑے سے الجھاؤ کے ساتھ اگر کسی مرد کے سر پر ہوں تو عورتیں اس کو اس کو آسانی کے ساتھ ادبی قسم کا آدمی سمجھ لیا کرتی ہیں اور بنے ہوئے بالوں والے مرد کے متعلق تو یہ پتہ نہیں چلتا کہ وہ کسی تھیٹر کا ایکٹر ہے یا کسی دفتر کا بابو۔ دوسرے یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ الجھے ہوئے نیم پریشان بالوں کے ساتھ پائپ بھی خوب سجتا ہے اور اس سے آدمی کے متفکر ہونے کا اندازہ ہو سکتا ہے ہم نے بالوں پر دونوں ہاتھ بے ترتیبی سے اِدھر اُدھر پھیر کر ان کو منتشر کر دیا اور اس طرح دل پر سے یہ بوجھ اتر گیا۔ کہ اب

کم سے کم خوبصورت بلا کے ہیرو تو نظر آئینگے اور نہ حاکم پرگنہ کے اہلمد اور نہ کسی کے اہل خانہ۔
دماغ تو ان احتیاطوں میں مصروف تھا مگر دل کو رضائی والے سربستہ راز کی
مستقل طور پر کھوج تھی "تو کیا واقعی اس کا نام ناہید درخشاں ہو گا"؟ بہرحال
ناہید درخشاں ہو گا"؟ بہرحال ناہید درخشاں نہ سہی طاؤس رقصاں سہی۔ مہ
کنعان ہی سہی، مگر ہو گا یقیناً کوئی نہایت ہی ادبی قسم کا کھنکھناتا ہوا نام اور اس نام
سے پہلے جب اس میں "آنسہ" لگا دیا جائیگا تو واقعی یہی معلوم ہو گا کہ کامدانی پڑی
ہوئی ارغوانی رضائی میں کامدار کا سنی گوٹ لگا دی گئی ہے اس قسم کی شریک زندگی
ایک شوہر کو کس قدر بلند کر سکتی ہے اسکا اندازہ ہر ایک نہیں کر سکتا حد یہ ہے کہ وہ
شریک سفر دھول پھانکنے اور سردی کھانیوالا مسافر بھی نہیں کر سکتا جو جمال ہمنشین
کی دولت سے مالامال ہونے کے باوجود محروم تھا۔ در اصل یہ لوگ آدمی تھوڑے
ہوتے ہیں چوپائے ہوتے ہیں مگر اسوقت ہمارا مستقبل ہمارے پیش نظر تھا۔ چمکتا ہوا
جگمگاتا ہوا۔ معطر معطر۔ لطیف لطیف۔ حسین حسین۔ بات یہ ہے کہ زندگی کا بہت
بڑا حصہ اسی منزل میں گذر گیا ہے۔ کہ کوئی تقریب ہو، کوئی اجتماع ہو، کوئی
محفل ہو ہم اپنی اہل خانہ کو ساتھ نہیں لیجا سکتے۔ سب اپنی اپنی بیویوں کو چمکائے ہوئے
اور خود چمکتے ہوئے آتے ہیں اور ہم "واحد حاضر" بنے ہوئے ہر جگہ نظر آتے ہیں۔
نہ ہوتی بیوی تو کوئی غم نہ تھا مگر بیوی موجود اور ہم تنہا۔ خلوت آباد جلوت
ویران۔ گھر میں عیالدار اور باہر بے وارثے بات یہ ہے کہ ڈرتے ہیں کہ کہیں

غلط ساری باندھ کر نہ پہونچ جائیں، کوئی بھونڈی بات نہ کہہ دیں۔ سر کے بال گنواروں کی طرح نہ سمجھ لیئے جائیں۔ ساری۔ جمپر۔ جوتے اور موزے کے رنگوں کا توازن اور تناسب مضحکہ خیز نہ ہو جائے یہ تمام اندیشے محض اس لیئے ہیں کہ بیگم صاحبہ کی تربیت بحیثیت ایک "بٹیا" کے ہوئی ہے بحیثیت "مس بابا" کے نہیں ہوئی ہے۔ اسکول اور کالج میں پڑھی ہوئی نہیں ہیں۔ ایسی بیوی کو کسی محفل میں لیجانا کسی وقت بھی خطرے سے خالی نہیں۔ مگر۔ . . . . اب انشاء اللہ العزیز یہ کمی پوری ہو جائیگی اب ہم بھی سوسائٹی میں بیوی کا، فردالا کوٹ اپنے کندھوں پر ڈال کر احباب سے سرخروئی کے ساتھ بات کر سکیں گے۔ اور اب ہماری مسز کے بھی نقرئی۔ طلائی اور گنگا جمنی قہقہے پارٹیوں کے سبزہ زاروں پر زمزمے برساتے اور رقص کرتے نظر آئیں گے۔ ہمارے منہ میں سگار ہے ہاتھ کی جیب میں اور ٹہل رہے ہیں وہ ایک حسین تیتری کی طرح اس صوفے سے اس صوفے پر اور اس صوفے سے اس صوفے پر اڑتی ہوئی نظر آرہی ہیں۔ ہائے کیا زندگی ہوگی۔ سوچتے سوچتے جسم کے رونگٹے کھڑے ہوگئے اور دل خود بخود گنگنانے لگا۔

ع میں چمن میں چاہے جہاں رہوں مرا حق ہے فصل بہار پر

یکایک رضائی میں پھر جنبش ہوئی رستارے جھلملائے۔ نظریں بہکیں۔ ریشم کے چھوٹے سے سمندر میں ہلکا سا طوفان آیا اور معلوم ہوا کہ ان کو کچھ زیادہ سردی لگ رہی ہے اسلیئے کہ پیر کچھ سکڑ گئے تھے اور رضائی کے نیچے جسم کچھ سمٹا ہوا سا نظر آرہا تھا۔ دل نے نعرہ

ایک لاجواب تدبیر سجھائی اور دماغ نے تائید کی ہم ایک دم بستر سے نکل کر ٹرین کے فرش پر کھڑے ہو گئے۔ ولایتی کمبل اٹھا کر اس زرکار رضائی پر آہستہ سے ڈال دیا۔ دیکھئے اس کو کہتے ہیں۔ سوجھ بوجھ، گویا وہ سوتی ہی رہیں اور ہم نے اپنا جادو جگا لیا اب جب وہ بیدار ہونگی اور اپنے اوپر اس کمبل کو دیکھیں گی تو ان کے سوالیہ نشان بنے ہوئے حسین چہرہ کے سامنے ہمارا صرف مسکرا دینا کافی ہو گا۔ اور اس مسکراہٹ پر ان کی وہ محجوب شکر گذاری اور ہماری شرافت کا وہ خاموش اعتراف بجائے خود نہایت لاجواب قسم کا تعارف ہو گا۔ اس قسم کے تعارف میں عدم واقفیت والی بیگانگی اور تکلّف بالکل نہیں ہوتا بلکہ دراصل تعارف تو پہلے ہی حاصل ہو چکتا ہے کچھ یوں ہی سی خانہ پُری باقی رہ جاتی ہے مقصد تو یہ ہے کہ ان کے دل میں جگہ پیدا کرنیکا ذریعہ چونکہ رسمی تعارف نہ ہو سکتا تھا۔ لہٰذا منجانب اللہ یہ ترکیب ذہن میں آگئی۔ اور ہم خوش ہو کر گنگنانے لگے۔ ؎

ہائے اس اون کے کمبل کی یہ قسمت، غالب
جس کی قسمت میں ہو محجوب کی سردی کھونا

ٹرین کی رفتار سست ہونے لگی۔ شاید کوئی اسٹیشن قریب تھا۔ چند ہچکولے کھانے کے بعد ٹرین ٹھہر گئی اور ٹرین کے ٹھہرتے ہی ہمارے ہی ڈبہ میں مسافروں کا وہ سیلاب آیا کہ الٰہی توبہ، گٹھڑی نما پگڑ باندھے ہوئے درجنوں لٹھ بند، گھونگھٹ نکالے ہوئے بچوں کو چمٹائے بیسیوں عورتیں، اور پھر ان سب کا سامان بستر۔ پوٹلے۔ پوٹلیاں

مختلف قسم کی ترکاریوں کے جھابے۔ برتنوں کی بوریاں، گھی کے پیپے، حقے، ٹوکرے، ٹوکریاں، ایک آفت ہی آگئی۔ کسی نے کسی کے سر پر قدم رنجہ فرمایا تو کوئی کسی کانے یا ٹک بن کر گود میں بیٹھ گیا۔ کوئی کسی سے ہاتھا پائی میں مصروف ہو گیا۔ اور کسی نے محض بحث و مباحثہ کو کافی سمجھا۔ خود ہمارے بستر پر ایک محترمہ ایک گز کا گھونگھٹ نکالے اپنے لخت جگر کو کلیجہ سے لگائے دودھ پلا رہی تھیں۔ اور ان کے دوسرے صاحبزادے ہمارے پھول دار تکیہ پر بیٹھے اپنے والدِ بزرگوار کو بھی وہیں بیٹھ جانے کی تاکید فرما رہے تھے مگر خود ہم اپنے بستر کی طرف سے بے فکر رضائی والی کا سپر بنے کھڑے تھے کہ کوئی اُن کے خواب ناز میں مخل نہ ہو۔ مگر آخر کب تک؟ جب لوگوں کو کہیں جگہ نہ ملی تو ادھر بھی متوجہ ہوئے اور ہم نے ایک گنوار کو دھکیلتے ہوئے کہا۔

"آنکھیں ہیں منہ پر یا نہیں، دیکھ رہے ہو کہ ایک عورت لیٹی ہے۔ اور گھسے پڑتے ہو۔"

"لیٹی ہیں تو اٹھا کے بٹھا دو نا ان کو بابو جی۔ ہم آخر کہاں بیٹھیں گے؟ کلوا کی ماں بیٹھ ادھر تو۔"

"نہیں یہاں کوئی نہیں بیٹھ سکتا۔"

"بیٹھ کیسے نہیں سکتا۔ ہم نے بھی ٹکٹ لیا ہے۔"

"نہیں مانو گے تم، ارے بھائی کہیں اور بیٹھ جاؤ۔ میرے بستر پر بیٹھ جاؤ"

رضائی کو پھر جنبش ہوئی۔ کمبل کھسکا۔ تارے جگمگائے اور "استغفر اللہ" کہتے ہوئے ایک بزرگ رضائی سے برآمد ہو کر بیٹھ گئے۔ ہم نے مسافروں سے لڑتے لڑتے ان بزرگ کو دیکھا۔ اگر گاڑی کھڑی نہ ہوتی تو شاید زنجیر کھینچ لینے کو دل چاہتا۔ مگر اب اس بوڑھی گھوڑی کی وہ لال لگام دیکھ رہے تھے۔ جس پر کامدانی کا ہر تارہ معلوم نہیں رو رہا تھا یا ہنس رہا تھا۔ دھوتی اوڑھنے والا مسافر اب تک بیٹھا ہوا سو رہا تھا۔ اور کمبل کے باوجود ہماری نیند غائب تھی۔

ہائے میں فدا ہو جاؤں ــــ!!!

دریائے گومتی کے کنارے سرکاری طور پر ایک شہر آباد ہے جس کو لکھنؤ کہتے کہتے ہیں۔ مگر ماہرینِ آثارِ قدیمہ کا خیال ہے کہ یہ ہرگز وہ لکھنؤ نہیں ہے جو دراصل لکھنؤ تھا۔ بلکہ خاص لکھنؤ اسی لکھنؤ میں خدا جانے کہاں روپوش ہو گیا ہے۔ اور ہم سب کے پیشِ نظر بناسپتی لکھنؤ ہے جس کو لکھنؤ کہنے کے لیے ہم اس لیے مجبور ہیں کہ اسٹیشن پر یہی نام لکھا ہوا ہے۔ خاص لکھنؤ کے روپوش ہونے کے متعلق بہت سی روایات مشہور ہیں۔ مگر سب سے زیادہ قرینِ قیاس یہ روایت ہے کہ بیرونی میل جول سے بچانے اور ٹکسال باہر کو ٹکسال اندر کرنے کے خوف سے لکھنؤ دانستہ چھپا دیا گیا ہے اور اس کا پتہ ایک ایسا راز ہے جس کے جاننے والے رفتہ رفتہ کم ہوتے جاتے ہیں۔ یعنی یہ راز روز بروز محفوظ ہوتا رہا ہے۔ لکھنؤ کے محلِ وقوع کے راز میں ہونے کی وجہ سے حدودِ اربعہ بھی

ڈانواں ڈول پھر رہا ہے اور بڑے بڑے سراغ رسانوں کا خیال یہ ہے کہ جس
دن حدود اربعہ مقرر اور متعین ہو گیا۔ محل وقوع کا پتہ لگنا اور زیادہ مشکل نہ
رہیگا۔ چند چیزیں جو مدّت کی کوششوں کے بعد معلوم ہو سکی ہیں۔ وہ بہت امید
افزا ہیں۔ مثلاً آب و ہوا کے متعلق خیال یہ ہے کہ وہ اب تک جوں کی توں ہو بشرطیکہ
آب و ہوا دونوں کو علیحدہ علیحدہ نہ کیا جائے۔ ورنہ اُن دونوں کے علیحدہ
ہو جانے کی صورت میں اندازہ آسانی سے ہو سکتا ہے کہ خالص لکھنؤ میں نہ آب تھا
نہ ہوا ۔ اس لیے کہ اگر یہ دونوں چیزیں ہوتیں تو میونسپل بورڈ کونسلوں کے ذریعہ
آب کا اور بجلی کمپنی کو پنکھوں کے ذریعہ ہوا کا انتظام کرنے کی زحمت ہرگز نہ ہوتی
بلکہ یہ دونوں محکمے کچھ اور مفید خدمات انجام دیتے جدید لکھنؤ کو جب یہ محسوس ہوا کہ
زندگی کے لیے ہوا اور پانی بھی ضروری ہیں۔ تو اس نے دو محکمے خاص طور پر ان
ہی اغراض کے لیے قائم کیے۔ چنانچہ اب پانی ملے یا نہ ملے مگر جن گھروں میں نل
ہیں وہاں یہ اطمینان ضرور رہتا ہے کہ اگر پانی ہوگا تو ملے گا ضرور۔ بالائی مکانات
چونکہ لکھنؤ کی عام سطح سے بلند ہوتے ہیں لہذا وہ حدود میونسپلٹی میں نہیں آتے۔
اور وہاں تک پانی پہونچانے کی کوئی اخلاقی ذمہ داری بھی مشکل ہی سے لی جا سکتی ہے۔

عام آب و ہوا کی طرف سے اہل شہر اب مطمئن ہیں کہ اس کے بدولت کم سے کم
آبادی کا بڑھنا نہیں پاتی۔ لکھنؤ کی کشش نے سارے ہندوستان کو اپنی طرف
سمیٹ لیا تھا اور اندیشہ تھا کہ لکھنؤ کو ہندوستان نہ بننا پڑے۔ اس لیے بہت

دنوں کی کوششوں کے بعد اب آب وہوا کو ایسا بنایا جا سکتا ہے کہ آبادی کا توازن قائم رہے۔ طرح طرح کے وبائی امراض ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر لائے گئے۔ اور ان کو جدید سائنٹفک اصولوں سے ترقی دی گئی۔ تو اب آبادی کے سلسلہ میں آمد و خرچ برابر ہو سکتا ہے اور انتظام ایسا ہو گیا ہے کہ آئندہ بھی یہ توازن گڑبڑ نہ ہونے پائے گا۔

آبادی کے سلسلہ میں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ لکھنؤ کی ذاتی آبادی اب کچھ نہیں ہے لوگ باہر سے آکر آباد ہو جاتے ہیں یہ اور بات ہے کہ پھر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے لکھنوی بن کر رہ جائیں۔ اس سرزمین نے جن کو پیدا نہیں کیا ہے۔ ان کو بھی نہایت شفقت سے اپنی آغوش میں لے لیتی ہے پھر یہی لوگ اپنے نام کے ساتھ لکھنوی لکھ لکھ کر یہ ثابت کرتے رہتے ہیں۔ کہ لکھنؤ کی اپنی ذاتی آبادی بھی ہے اور لکھنؤ ہر چند کہ نہیں ہے مگر ہے ضرور۔

جن چیزوں کا اب تک پتہ چل چکا ہے ان میں سے ایک پیداوار بلکہ بجا ہو لکھنؤ کی خاص پیداوار یہاں کے شاعر ہیں جو عام طور پر پائے جاتے ہیں۔ اور اس کثرت سے پائے جاتے ہیں کہ گذشتہ مردم شماری کے اعداد سے شاعروں کی تعداد زیادہ تھی۔ شاعر لکھنؤ میں اس شخص جگہ یا چیز کو کہتے ہیں جس کے نام کے ساتھ ایک تخلص بھی لگا ہو۔ لکھنؤ کی یہ مخلوق شعر کہتی اور داد کے سہارے جیتی ہے۔ اس مقصد کے لیے آئے دن مشاعرے منعقد ہوتے

رہتے ہیں تاکہ مذاق ملتی رہے اور شاعری باقی رہیں اس مذاق کو فروغ دینے کے لیئے اس کی عام اجازت ہے کہ جس کا جی چاہے شاعر بن جائے نہ کوئی اخلاقی پابندی ہے نہ کوئی قانونی روک تھام۔ مشاعرے بھی بغیر حکام کی اجازت حاصل کیئے ہوتے رہتے ہیں۔ اور قابل دست اندازی پولیس نہیں سمجھے جاتے۔

تجارت کے سلسلہ میں یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ لکھنؤ ہمیشہ سے تاجر ہونے کے بجائے گاہک ہونا پسند کرتا چلا آیا ہے۔ پھر بھی چونکہ ایک شہر کے لیئے بازاروں کا ہونا اور بازاروں میں دوکانوں کا ہونا ضروری ہے۔ لہذا یہاں بھی کنکوؤں کی تجارت پر زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ ویسے بالائی اور شیرمالوں کی دوکانیں بھی پائی جاتی ہیں۔ بید مشک کی کھپت بھی زیادہ ہے۔ اور دوکانیں بھی کافی ہیں۔ مگر یہ تجارت کوئی نفع کی غرض سے نہیں کی جاتی بلکہ محض اخلاقاً اور اس طرح کہ گویا مقطع میں سخن گسترانہ بات آپڑے۔

صنعت وحرفت کے سلسلہ میں لکھنؤ کو خاص شہرت حاصل رہی ہے یہاں کی خاص صنعت۔ یہاں کی زبان ہے زبان کے بہت بڑے بڑے کارخانے ہیں جہاں زبان ڈھالی جاتی ہے محاورے تیار کیئے جاتے ہیں۔ تیار شدہ محاوروں کی مرمت ہوتی ہے۔ زبان کے عیوب نکالے جاتے ہیں اس کو صاف کیا جاتا ہے اس میں شیرینی پیدا کی جاتی ہے اس کو نرم اور لطیف بنایا جاتا ہے۔ اس میں نہایت دل آویز لوچ اور نہایت دلکش لچک پیدا کی جاتی ہے باہر سے

آئی ہوئی زبان زر ازیوں کو جانچا جاتا ہے۔ مختصر یہ کہ زبان کے سلسلہ میں تمام خدمات انجام پاتی ہیں حرفت میں یہاں کا تکلف خاص طور پر مشہور رہے اس میں علم مجالس نشست و برخاست۔ ملنے چلنے۔ بات کرنے، کپڑا پہننے۔ کھانا کھانے مختصر یہ کہ ہر موقع کے لیے پُر تکلف آداب وضع کئے جاتے ہیں اور جو آداب وضع ہو چکے ہیں۔ ان کی حفاظت کی جاتی ہے بات کرنے کے اوزان مقرر ہیں اور ان اوزان کی پابندی سے بات کرنا بجائے خود صنعت بھی ہے اور حرفت بھی۔

تعلیم کے سلسلہ میں صرف اس قدر کہہ دینا کافی ہے کہ یہاں تعلیم کی چنداں ضرورت نہیں۔ تعلیم کا مقصد شعور پیدا کرنا ہے اور شعور یہاں بغیر تعلیم کے بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ لہٰذا اس تضیع اوقات کی ضرورت بہت کم محسوس کی جاتی ہے۔ پھر بھی بہت سی بیکار چیزوں کی طرح یہاں بھی کافی تعلیمی ادارے ہیں جن میں کھیل کود کا شغل رہتا ہے۔

روزگار عموماً بے روزگاری کا ہے اور اگر بے روزگاری کا سلیقہ کسی خطہ میں پایا جاتا ہے تو لکھنؤ میں، یہاں کا بے روزگار سے بے روزگار انسان بھی اس قدر مصروف نظر آتا ہے۔ گویا بیک وقت کئی محکموں کا انچارج ہے یہاں تک کہ آپ اس کو بے روزگار کہنے کی جرأت مشکل ہی سے پیدا کر سکتے ہیں عام حالات یہ ہیں کہ یہاں کبھی عام حالات پیدا نہیں ہوتے۔ ہر عمومیت

میں ایک نہ ایک خصوصیت ضرور ہوتی ہے۔ یہاں کی غریبی بھی عام غریبی سے مختلف ہے اور امیری بھی عام امیری سے جداگانہ۔ غربا میں ایک خاص وقار اور امرا میں ایک خاص انکسار بھی پایا جاتا ہے۔ اپنی اصل حالت کوئی کسی کو نہیں بتاتا۔ یہی وجہ ہے کہ کوئی بات بھی عام نہیں ہونے پاتی اور کسی قسم کے حالات عام حالات نہیں بنتے۔

اتنی باتوں کے معلوم کر لینے کے بعد بھی سراغ رسانوں کو گمشدہ لکھنؤ کا اب تک پتہ نہیں چلا مگر تحقیقات جاری ہے اور تفصیلات کا انتظار۔ خیال غالب ہے کہ لکھنؤ اگر واقعی اب تک موجود ہے تو ضرور مل کر رہے گا۔ اور ایک مرتبہ مل جانے کے بعد پھر اس کا گم ہونا اس محکمۂ آثارِ قدیمہ کے دور میں آسان نہ رہے گا۔

کہا جاتا ہے کہ۔

ع۔ خدا آباد رکھے لکھنؤ کو پھر غنیمت ہے

اس ایک مصرعہ میں "پھر" اور "غنیمت" لکھنؤ کی بربادی پر بہے ہوئے دو آنسو ہیں۔ جس "پھر بھی غنیمت" لکھنؤ کو ہم اب دیکھ رہے ہیں وہ بھی اس تیزی سے اپنی روایات کو بھلا رہا ہے کہ کچھ ہی دنوں میں اس مصرعہ کا "پھر" اور اس کے بعد دیکھتے ہی دیکھتے "غنیمت" بھی غائب ہو جائیگا۔ البتہ یہ دعا

شائد مقبول ہوجائے کہ لکھنؤ آباد ضرور رہے گا۔ مگر اپنی لکھنؤیت کے ساتھ نہیں بلکہ ہندوستان کے دوسرے بڑے شہروں کی طرح کا ایک شہر بن کر لکھنؤ کے متعلق معلوم نہیں یہ نیک فال ہے یا بدشگونی بہر حال جو کچھ بھی ہے اس کے آثار اب خود لکھنؤ میں نظر آنے لگے ہیں کہ لکھنؤ کی جس تہذیب اور تکلف کا مذاق باہر والے اڑایا کرتے تھے۔ اب اسی تہذیب اور تکلف پر خود بخود مسکرانے لگا ہے۔ پہلے آپ، اور نہیں حضرت پہلے آپ، قسم کے تکلفات پر پہلے وہ لوگ ہنسا کرتے تھے۔ جو ان آداب کی پابندی کرنا نہیں جانتے تھے۔ لیکن اب ان آداب کو بھولنے والے بھی لکھنؤ کی تہذیب کی ان نزاکتوں کو چونچلہ اور ڈھکوسلہ وغیرہ کہہ کر ان تکلفات کو اپنے لیئے تکلیف دہ پاتے ہیں۔ اور خدا بھلا کرے ذوق کا، جو ان بے تکلف لوگوں کے لیئے ایک سدابہار عذرِ لنگ ارشاد فرما گئے ہیں کہ ؎

اے ذوق تکلف میں ہے تکلیف سراسر
آرام سے ہیں وہ، جو تکلف نہیں کرتے

مگر تکلف کی گہرائیوں میں جائیئے تو تکلف کی ابتدا وہاں سے ہوتی ہے۔ حضرت آدم نے پتوں سے ستر پوشی کی تھی یہ تمام بالوں کی آرائشیں لباسوں کی کانٹ چھانٹ اور اسی طرح زندگی کے ہر شعبہ میں ہر قسم کا سلیقہ سوائے تکلف کے اور ہے کیا۔ گو آرام سے وہ رہ سکتے ہیں جو انسانیت کے قریب ہی نہ آئیں۔ اور

چوپایوں کی بے تکلفی سے سبق لیں۔ اس میں شک نہیں کہ لکھنؤ نے تکلفات کی حد کر دی تھی۔ مگر اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ شاہی زمانے کے تمام درباری تکلف اہل لکھنؤ کے لیے روز مرہ بن گئے تھے۔ اور چونکہ وہ ان تکلفات کے عادی ہو گئے تھے۔ لہٰذا ان کو کوئی تکلیف نہ ہوتی تھی۔ اور ان کی شائستگی خود ان کے لیے ایک بے ساختہ سی چیز بن کر رہ گئی تھی۔ علم مجلس نشست و برخاست صرف مجلسی زندگی تک محدود نہ تھا۔ بلکہ گھر میں اور باہر یکساں قسم کی باقاعدگی سی معلوم ہوتی تھی۔ برابر والوں سے ملنے، چھوٹوں سے ملنے اور بڑوں سے ملنے کے کچھ الگ الگ آداب تھے۔ جن کی پابندی وہ اپنے اوپر فرض سمجھتے تھے تاکہ ان کی شاہانہ تہذیب اور لکھنؤ کی شائستگی پر حرف نہ آئے۔ اسی مہذب نشست و برخاست سے صاحب محفل نہایت خاموشی کے ساتھ اہل محفل کو یہ بتا دیتا تھا۔ کہ ہر نئے آنے والے سے اس کے تعلقات کس قسم کے ہیں اور اسکا درجہ اس کی نظروں میں کیا ہے۔ مثلاً کسی کے لیے سرو قد کھڑے ہو کر اور لب فرش تک جا کر استقبال کرنے کے معنی یہ ہوئے کہ آنے والا صاحب محفل کے لیے بزرگ و برتر کا درجہ رکھتا ہے اور چونکہ صاحب محفل ان کو یہ عزت دے رہا ہے لہٰذا تمام اہل محفل پر اسکا احترام فرض ہے۔ سب کھڑے ہو جائیں گے اور اس وقت تک کھڑے رہیں گے جب تک کہ وہ بیٹھ نہ جائے کوئی اس سے کم مرتبہ کا شخص آیا تو

صاحب محفل صرف کھڑے ہوکر تعظیم دیں گے۔ لب فرش تک جانے کی ضرورت نہیں۔
اس سے بھی کم درجہ کا شخص آیا تو صرف ساٹھ ڈگری کے زاویہ تک اُٹھنا کافی ہوگا
کسی کے لیۓ محض تیس ہی ڈگری کا زاویہ کافی ہوگا۔ اور کسی کے لیۓ بیٹھے ہی بیٹھے
یہ کہدینا کافی ہے کہ "تشریف لائیۓ جناب" یا کوئی بے تکلف دوست آگیا تو نہایت
تکلف کے ساتھ بے تکلفی ہوگئی کہ "تشریف لائیے سرکار!" ع

بڑی دیر کی مہرباں آتے آتے

کسی اور نے ایک چھینٹا مارا کہ حضرت :-

"ہوئی تاخیر تو کچھ باعث تاخیر بھی تھا"

ایک تیسرے دوست نے برجستہ کہدیا:-

"کہیں یہ نہ پوچھ لیجیۓ کاکہ عنان گیر کون تھا"

مگر یہ باتکلف بے تکلفی بھی ان بزرگ کی موجودگی میں مشکل ہی سے ہوسکتی
ہے جن کے لیۓ لب فرش تک استقبال کیا گیا تھا۔ ان کے سامنے تو خود
صاحب محفل ان کو صدر میں بٹھاکر دوزانو بیٹھیں گے۔ ان کو کوئی چیز پیش
کریں گے تو کھڑے ہوکر ان سے کوئی چیز لیں گے تو متعدد تسلیمات کے بعد
مگر ایسے بزرگ خود بھی خوردوں کی محفل میں زیادہ نہ ٹھہرتے تھے۔ مگر ان کے
تشریف لے جانے کے بعد بھی برابر والے بے تکلف دوستوں کی اس محفل
میں بھی شائستگی باقی رہتی تھی۔ کوئی ایک دوسرے کی طرف پشت کرکے نہ

نہ بیٹھنا۔ گفتگو میں بھی آپ اور جناب۔ حضور، اور سرکار۔ حضرت اور بندہ نواز کے علاوہ اس بات کا خاص خیال رکھا جاتا۔ کہ کوئی ایسی بات بے تکلفی میں بھی زبان سے نہ نکل جائے جس سے کسی کی ہتک کا کوئی پہلو نکلتا ہو۔ یا مخاطب کو یہ محسوس ہوسکے کہ اس کی عزت کرنے میں کوتاہی سے کام لیا جا رہا ہے پیچوان اور خاصدان تک کے پیش کرنے میں اس قسم کی احتیاطوں سے کام لیا جاتا تھا۔ کہ ملازم صاحب محفل کے پاس پیچوان یا خاصدان رکھ گیا ہے تو خود صاحب محفل اٹھ اٹھ کر حاضرین کو پیش کریں گے اور حاضرین کھڑے ہو ہو کر یا مختلف زاویوں سے کھڑے ہو کر سلام کر کر کے لیں گے۔ بذلہ سنجیاں ہوں گی۔ لطیفہ گوئیاں ہوں گی۔ شعر و شاعری کا ذوق ہے تو اس کا چرچہ رہے گا۔ علمی ذوق ہے تو علمی مباحث چھڑ جائیں گے۔ مگر جو کچھ بھی ہو گا تہذیب کے دائرے میں۔ کسی نے کسی کے لطیفے کی داد دی۔ اور وہ آداب بجا لا کر کھڑا ہو گیا۔ کسی نے کسی کے شعر کو سراہا اور وہ تسلیمات عرض کرتا ہوا دست بستہ ہو گیا کہ "میں کس قابل ہوں یہ سب ذوقِ سماعت ہے"۔ یا شعر پیش کرتے ہوئے خاص طور پر توجہ دلانے کے لئے اپنے بہت اچھے شعر کو یہ کہہ کر پیش کر دیا کہ "شاید کسی قابل ہو"۔ یہ چند باتیں بھولے ہوئے سبق کی طرح لکھنؤ کے مشاعروں میں اب تک نظر آ جاتی ہیں۔ مگر اب وہ مشاعرے بھی ختم ہو رہے ہیں۔ فرش

کی جگہ مشاعرے کرسیوں پر ہونے لگے ہیں۔ دورِ مشاعرہ قائم ہونے کے
بجائے پلیٹ فارم اور اسٹیج کا رواج بڑھ رہا ہے۔ شمع محفل کب کی گل
ہو چکی۔ پیچوانوں کی جگہ مشاعروں میں سگریٹ اُچھلنے لگے ہیں۔ اور
پانوں کی شالبانہ منڈھی کاغذی ہانڈیوں کی جگہ رکابیوں میں بیڑے
تقسیم ہوتے ہیں۔ مگر اس قسم کے فقرے مشاعروں میں اب تک سننے میں
آجاتے ہیں: "کہ آداب بجا لاتا ہوں۔ دل بڑھاتے ہیں آپ، ملاحظہ ہو
شاید کوئی نئی بات عرض کی ہے" ورنہ اب تو مشاعروں کا یہ رنگ
ہے کہ داد کی جگہ تالیاں بجتی ہیں۔ اور شاعر سلام کرنے کی اس طرح
اکڑ جاتا ہے کہ سلام کس بات کا۔ زمانہ ہمارا ایک حق تھا جو ہم کو ملا کسی
نے بخشش تھوڑی دی ہے کہ سلام کیا جائے۔

سلام پر یاد آیا کہ لکھنؤ کے "آداب عرض" اور "تسلیمات عرض"
پر بھی لوگ ہنستے ہیں کہ یہ کلائی کے قریب کوئی کمانی فٹ ہوتی ہے۔
یا کیا کہ ایک سلام کرنے کے لیے خدا جانے جلدی جلدی کتنی ہی
جنبشیں دے دی جاتی ہیں۔ ورنہ سلام کا عام طریقہ یہ ہے کہ ایک
مرتبہ پیشانی کی طرف ہاتھ گیا اور قصہ ختم، ہو گیا سلام، یہ کیا کھڑے لچکا رہے
ہیں ہاتھ بید کی طرح، اور تسلیم بھی نہیں بلکہ کہہ رہے ہیں۔ تسلیمات کو نشانہ
اس بات پر ہنسنے کی جگہ اگر ذرا بھی غور کیا جاتا تو یہ بات سمجھ میں آسکتی

تھی۔ سلام کا یہ طریقہ بھی شاہی دربار سے نکلی ہوئی ایک چیز تھا۔ دربار میں سلاموں کی تعداد مقرر تھی۔ اسی طرح امراء کے لیئے بھی سلام مقرر تھے۔ مثلاً سات سلام یا پانچ سلام یا تین سلام، سلام کا مقصد تعظیم دینا ہے اور سلام ہمیشہ چھوٹا بڑے کو کرتا ہے۔ لہٰذا لکھنؤ کے سعادت مند خوردوں نے اپنے شفیق بزرگوں کو وہی تعظیم دینا شروع کر دی جو رعایا بادشاہ کو دیتی ہے یا غریب امیر کو دیتے ہیں۔ تسلیم کے بجائے تسلیمات اور کورنش کی جگہ کورنشات کا متعدد سلاموں سے مطلب ہے کلائی کو بار بار جنبش دینے کا مقصد بھی یہی ہے کہ کئی سلام کر لیے۔ اسی طرح "آداب بجالاتا ہوں" کا تفصیلی مطلب ہے کہ وہ تمام آداب بجالاتا ہوں۔ جو ایک خورد کو اپنے بزرگ کے سامنے، ایک کمتر کو اپنے بہتر کے سامنے جھک کر متعدد سلام کر کے اور دست بستہ کھڑے ہو کر بجا لانا چاہییں۔

اسی طرح لکھنؤ کے لب و لہجہ میں اور گفتگو میں "چناں چنیں" یہ بھی لوگ سنتے ہیں۔ مگر اس پہ بھی غور کیا جائے تو شاہان اودھ کی وہ تاریخ سامنے آ جائے گی۔ جس نے یہ تمام طریقے اپنے دربار میں پروان چڑھائے تھے۔ شاہان اودھ کی دلچسپیوں کے مرکز ان کے محلات ہوا کرتے تھے۔ وقت کا بیشتر حصہ بیگمات کے ساتھ گذرتا تھا لہٰذا قدرتی طور پر زبان

میں وہی لوچ اور نزاکت پیدا ہو گئی۔ جو بیگمات کی زبان میں ہوا کرتی تھی۔ لب و لہجہ میں بھی نسائیت سما گئی اور بادشاہ نے سر دربار بھی یہی محلسرائی زبان اختیار کی نتیجہ یہ ہوا کہ اہل دربار کی زبان بھی وہی بن گئی اور رفتہ رفتہ لکھنؤ کی اصل زبان بیگماتی زبان قرار پائی مگر اس میں شک نہیں کہ اس زبان کی لطافت کچھ اور نکھر آئی عام زبان اور خاص زبان میں پھکڑاؤ اور گل افشانی کا نمایاں فرق محسوس ہونے لگا مثلاً ایک معمولی سا فقرہ ہے: "والد صاحب مرحوم و مغفور کہا کرتے تھے" اسی بات کو اگر یوں کہا جائے کہ "ابّا جان جنت مکانی کا ارشاد تھا" اب دونوں کا نمایاں فرق محسوس کریئے معلوم ہوتا ہے کہ پہلے جملے نے سماعت پر کچھ پتھر برسائے تھے اور اس جملہ نے پھول برسائے ہیں۔ والد صاحب مرحوم و مغفور میں وہ محبت بھی محسوس نہیں ہوتی جو ابّا جان جنت مکانی میں ہے۔

رہ گیا "چناں چنیں" والا اعتراض، یہ ہے تو درست مگر اس کی وجہ بھی زیادہ ترشائستگی ہے۔ لکھنؤ کی شاہانہ تہذیب نے اس کی اجازت کبھی نہ دی کہ کسی ناگوار بات کو براہ راست ناگوار طریقہ پر ادا کر دیا جائے۔ اگر ایک ناگوار بات بھی خوشگوار طریقہ پر کہی جا سکتی ہے تو کیوں نہ کہی جائے۔ مثلاً غصہ میں کسی سے یہ کہنا کہ میں تمھاری شرارتوں کو خوب

سمجھتا ہوں۔ پھر میں جو کچھ کہونگا تو تم کو برا لگے گا" بظاہر اس جملہ میں بھی غصہ کو دبےہوئے شائستگی موجود ہے مگر اس موقع پر ایک خالص لکھنوی کچھ اور ہی کہے گا اس کے تیور بھی کچھ اور ہونگے۔ وہ پہلے تو غصہ کو پی گا پھر شائستگی کا سہارا لیکر سنبھلے گا اور آخر میں یہ کہہ دیگا۔ کہ :۔ ؎

آپ ہی اپنے ذرا لطف و کرم کو دیکھیں

ہم اگر عرض کریں گے تو شکایت ہوگی

شرارت کی جگہ لطف و کرم کہنا "چناں چنیں" ہے مگر غور تو کیجئے شرارت میں وہ زہر نہیں ہے جو لطف و کرم میں ہے اس قسم کی چناں و چنیں ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہے کہاں تک کوئی کونین پر شکر لپیٹنے کا خیال رکھ سکتا ہے مگر اہل لکھنؤ جو اپنی اس خصوصیت کو بھولتے جاتے ہیں پہلے بے تکلفی اور روانی کے ساتھ اسی قسم کی گفتگو کیا کرتے اور اس درباری احتیاط نے رفتہ رفتہ عادت کی صورت اختیار کر لی تھی۔

اور کچھ نہ بھی سہی تو بھی یہ ماننا پڑے گا کہ اس تکلف اور شائستگی نے لکھنؤ میں جو بلا کی قوت برداشت اخلاق کے نام سے پیدا کر دی تھی اسکا اب کہیں پتہ نہیں چلتا کسی کے ساتھ ہمدردی کرنا یا نہ کرنا یہ دوسری بات ہے مگر ایک دوسرے کا درد دل انتہائی یگانگت کے ساتھ سنتے تھے اور اس قسم کی گفتگو کرتے تھے کہ پریشان حال کو محض الفاظ سے تسکین ہو جایا کرتی تھی۔ آجکل کی سوسائٹی میں

تو اگر کوئی شخص اپنی ماں یا باپ کی بیماری کا ذکر دے تو لوگ اس کو بدتمیز سمجھتے ہیں۔ مگر ذرا دیکھیے ان بادضع اہل لکھنؤ کو جو احباب کی بٹیروں تک کا حال پوری ہمدردی سے دل بستگی سے گھنٹوں سنا کرتے تھے اور کیا مجال کہ چہرہ پر ذرا بھی بے توجہی پائی جائے۔ کسی کا بس یہ کہہ دینا شرط ہے کہ :-

"کیا عرض کیا جائے بٹیر جنگ کی علالت نے اور بھی رہے سہے اوسان کھو دیے ہیں۔"

دوسرے صاحب فوراً تشویش کیسا تھ کہتے "بفضیب دشمناں کب سے علیل ہے"؟-

تیسرے صاحب بولتے "حضرت علیل کیا ہے ہمیشہ بھائی صاحب سے عرض کیا کہ نظر اتار دیا کریں۔ میری آنکھوں میں خاک اس کے تیور ہی ایسے ہیں کہ نظر لگ جائے پچھلی پالی میں دیکھا نہیں آپ نے۔ چشم بد دور وہ پوٹا تان کر کھڑا ہوا ہے کہ میرا تو کلیجہ دھک سے ہوگیا تھا کہ نہ جانے کیا ہونے والا ہے بلکہ میں نے بھائی صاحب کی خدمت میں عرض کیا تھا کہ پیشانی پر کاجل کا ٹیکہ لگا دیں یا کوئی سیاہ ڈورا گلے میں باندھ دیں۔

بٹیر والے صاحب فرماتے ہیں "حضرت کونسی جھاڑ پھونک ایسی تھی جو نہ کی ہو اب میرن صاحب کے نسخے سے کچھ افاقہ ہوا ہے"۔

دوسرے صاحب کہتے ہیں "بھئی شکر ہے کہ افاقہ کا مژدہ تو سنا میرے تو پیروں تلے کی زمین ہی نکل گئی تھی"۔

یہ ظاہر ہے کہ ان میں سے کسی کو بھی بٹیر کی جان ہرگز عزیز نہ ہوگی۔ مگر مروّت بھی کوئی چیز ہے۔ ایک دوست کی اس تفریحی مصیبت تک سے سب بظاہر پریشان ہو گئے۔ اس دوست کو کچھ اور نہیں تو کم از کم یہ اندازہ تو ضرور ہوا ہوگا کہ مجھ سے ہمدردی کرنیوالے اس دنیا میں موجود ہیں جو بٹیر کی بیماری پر اس قدر ہمدردی کر سکتے ہیں وہ انسان کی بیماری پر تو ظاہر ہے کہ اس سے بھی کچھ آگے بڑھ جاتے ہونگے۔ مگر اب تو وہ مروت، وہ ہمدردی اور وہ رفاقت ہی تاریخ بن کے رہ گئی ہے۔ بٹیر کی علالت پر ہنسنے کو سب ہنس دینگے مگر بٹیر کے بہانے جس اخلاق کا مظاہرہ ہوا ہے اسکی گمشدگی پر رونیوالا ایک بھی نہ ہوگا بلکہ کہنے والے ڈھٹائی سے یہی کہدیں گے کہ شکر ہے وہ ریاکاری گئی۔ حالانکہ یہ کہنے کا حق اس وقت حاصل ہوتا ہے جب بٹیر کے لئے نہیں کسی انسان کے لیئے اس جھوٹی ہمدردی کی طرح کی سچی ہمدردی اپنے اندر پیدا کر لیں۔ جھوٹی ہمدردی تو خیر گئی۔ مگر رونا تو یہ ہے کہ سچی ہمدردی پیدا نہ ہوئی اور جھوٹی بھی ہاتھ سے گئی۔

لکھنؤ کے شاہانہ تکلفات کا تو کہنا ہی کیا۔ یہ تو صرف چند اوپری باتیں ہیں جو دربار سے نکل کر اہل لکھنؤ کی عام زندگی بن گئی تھیں ورنہ درباری لباس، درباری دسترخوان، درباری محفلیں، درباری نشست و برخاست وغیرہ کے تکلفات کا تو اگر ذکر بھی کیا جائے تو لوگ یہی کہیں گے کہ یہ درباری جھوٹ ہے اور ایسے جھوٹے آجکل نہیں ملتے۔

(ختم شد)